خطباتِ اعجاز

جلد دوم

عارف باللہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب نور اللہ مرقدہ

(بانی مدرسہ سراج العلوم سراج نگر چھپرا ضلع مئو یوپی) کے

دینی و اصلاحی خطبات و بیانات

نقل و تدوین

مولانا محمد اشہد اعظمی

مدرسہ عربیہ سعیدیہ اشرف العلوم مصطفی ایجوکیشنل سوسائٹی

کرتھیا، مہراج گنج، یوپی

خطباتِ اعجاز

عارف باللہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب نور اللہ مرقدہ

کے دینی واصلاحی خطبات و بیانات

(جلد دوم)

نقل و تدوین

مولانا محمد اشہد اعظمی

ناشر

مدرسہ عربیہ سعیدیہ اشرف العلوم مصطفیٰ ایجوکیشنل سوسائٹی

کرتھیا، مہراج گنج۔ یوپی

فون نمبر- 9455675877

تفصیلات

نام کتاب	خطباتِ اعجاز (دینی واصلاحی خطبات)
خطیب	عارف باللہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب نور اللہ مرقدہ
ترتیب وتدوین	مولانا محمد اشہد اعظمی
باہتمام	مولانا قمر الحسن قاسمی صدر المدرسین مدرسہ عربیہ سعیدیہ اشرف العلوم
صفحات	۲۲۴
سنہ طباعت	۲۰۱۹ء
ناشر	مدرسہ عربیہ سعیدیہ اشرف العلوم مصطفیٰ ایجوکیشنل سوسائٹی کرتھیا مہراج گنج
قیمت	

ملنے کے پتے

☆ مولانا اعجاز احمد اعظمی لائبریری، چھپرا، چریاکوٹ، ضلع مئو 9936029463

☆ مکتبہ ضیاء الکتب خیرآباد محلّہ اترار ی ضلع مئو 9235327576

☆ مفتی روح اللہ صاحب، فلاح المسلمین گواپوکھر مدھوبنی 9852685298

☆ اعظمی کتاب گھر مدرسہ تعلیم الاسلام جامع مسجد اعظم گڑھ 9695174799

المحتویات

❑❑❑

چند باتیں

مولانا اعجاز احمد اعظمی نور اللہ مرقدہ کے خطبات کی دوسری جلد آپ کے ہاتھ میں ہے۔اس جلد کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے بیشتر خطبات مولانا اعظمی کے اعظم گڑھ جامع مسجد میں دیے گئے مقبول عام وخاص درسِ قرآن پر مشتمل ہیں۔اس جلد میں صرف انھیں تقریروں کو شامل کیا گیا ہے جس میں تذکیر ونصیحت سورہ احزاب کے کسی رکوع یا آیت کے ضمن میں ہے۔ان کے علاوہ بھی جامع مسجد اعظم گڑھ کے متعدد درسِ قرآن ریکارڈنگ کی صورت میں محفوظ ہیں،ان شاء اللہ تیسری جلد میں انھیں شامل کیا جائے گا۔

اس جلد کی ترتیب وتدوین میں چند امور کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے جنھیں ذکر کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے:

۱- ہر درس کے لیے درس کے مضامین کے مطابق ایک مرکزی عنوان تجویز کیا گیا ہےاور قارئین اور مقررین کی سہولت کے لیے متعدد ذیلی عناوین بھی قایم کیے گئے ہیں۔

۲- تقریر وتحریر کے انداز میں دو انتہاؤں کا فرق ہوتا ہے، بولنے میں بہت سے زوایدراہ پاجاتے ہیں،دونوں انتہاؤں کو قریب کرنے کے لیے زوایدکو حذف کردیا ہے اور کوشش کی گئی کہ حتی الامکان تقریر کو تحریر سے اتنا قریب کردیا جائے کہ تقریر کا لطف بھی متاثر نہ ہو اور تحریر کی روانی کا شمہ بھی آجائے،تاکہ مطالعہ میں کسی طرح کی الجھن یا مشکل نہ پیش آئے۔

۳- آیات واحادیث کے حوالے کا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے۔حوالے حاشیہ کی

بجائے آیت وحدیث کے معاً بعد نقل کر دیے گئے ہیں، تاکہ حوالہ دیکھنے کے لیے علاحدہ کوئی عمل نہ کرنا پڑے اور مطالعہ کے تسلسل میں کسی طرح کا کوئی خلل نہ آئے۔

۴- اعظم گڑھ جامع مسجد کے جو دروس ہیں، ان کی وضاحت مرکزی عنوان کے ساتھ ہی لکھ کر کر دی گئی ہے۔ جن تقریروں کے شروع میں 'جامع مسجد اعظم گڑھ' لکھا ہوا نہ ہو تو اس کا مطلب ہے کہ وہ جامع مسجد اعظم گڑھ کے سوا کسی اور جگہ، کسی اور موقع سے دیا گیا درس قرآن ہے۔

اس مجموعۂ خطبات کی تیاری اور معاونت میں مولانا محمد توقیر اعظمی صاحب اور مولانا محمد عامر اعظمی صاحب نے پوری فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ استاذ مکرم مولانا ضیاء الحق خیرآبادی صاحب نے اپنی دیرینہ روایت کے مطابق نہ صرف اس کی طباعت میں دلچسپی لی، بلکہ میری درخواست پر اس کے لیے بعجلت تمام ایک پیش لفظ بھی تحریر فرمایا۔ مولانا قمرالحسن قاسمی صاحب صدر مدرس مدرسہ عربیہ سعیدیہ کُرتھیا مہراج گنج نے اشاعت کی ذمہ داری لے کر طباعت کے پیچیدہ مسئلہ کو حل کر دیا۔ مولانا محمد راشد اعظمی صاحب نے بھی کسی طرح کے تعاون سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ ان تمام حضرات کا صمیمِ قلب سے شکریہ، اور بارگاہ رب الصمد میں دعا ہے کہ اللہ تعالی صاحبِ خطبات کو اور معاونین کو بہترین اجر سے نوازیں اور کتاب کو حسنِ قبول عطا کریں اور صدقۂ جاریہ بنائیں۔ آمین

❑❑❑

پیش لفظ

مولانا ضیاء الحق خیرآبادی صاحب

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اس سے لگاؤ، تعلق اور وابستگی خود صاحبِ کتاب سے محبت و تعلق اور شیفتگی و وابستگی کی دلیل ہے۔ استاذ محترم حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی علیہ الرحمہ پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل اور عنایت تھی، قرآن کریم سے ان کو ایک خاص تعلق تھا، خدمتِ قرآن کی ان کو متعدد جہات سے توفیق ملی۔ تعلیمی سلسلے کے اختتام کے بعد انھوں نے صرف چار ماہ میں قرآن کریم حفظ کیا، گھر پر قیام کے دوران گاؤں کے نوجوان حفاظ کو ترجمہ وتفسیر کے ذریعہ فہم قرآن سے قریب کرتے رہے۔ جب تدریس کا سلسلہ شروع ہوا تو اکثر و بیشتر تفسیر جلالین آپ سے متعلق رہی۔ اخیر عمر میں اس تفسیر کی شرح اردو زبان میں لکھنی شروع کی جو خرابیِ صحت اور گونا گوں امراض کی وجہ سے نامکمل رہ گئی، لیکن اس کی مطبوعہ ایک جلد سے ان کے خیالات وافکار اور طریقۂ کار کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔

خدمتِ قرآن کے تعلق سے مولانا کا ایک بڑا کام عوامی درسِ قرآن کا سلسلہ ہے، جس سے عمومی طور پر لوگوں کو بہت نفع ہوا۔ اس کا سلسلہ ابتدائی تدریس کے زمانہ سے ہی شروع ہوگیا تھا۔ چنانچہ غازی پور اور اس کے بعد جہاں بھی رہے کم وبیش یہ سلسلہ جاری رہا، اپنے مختلف تبلیغی واصلاحی دورے میں جہاں ہفتہ عشرہ قیام رہتا تھا، دیگر پروگراموں کے ساتھ فجر بعد یا عشا بعد درسِ قرآن کا سلسلہ ضرور رہتا تھا۔ اس کا مشاہدہ

میں نے کلکتہ، ارریا، دیناج پور اور بہار کے طویل سفر میں کیا۔ ایک عرصہ تک اپنے وطن بھیرا میں اور اس کے بعد شیخو پور میں تراویح کے بعد درسِ قرآن کا سلسلہ رہا، بلکہ اخیر زمانہ کی تقریروں اور مواعظ میں بھی درسِ قرآن کی جھلک صاف محسوس ہوتی تھی۔

اس سلسلے کی سب سے اہم خدمت اعظم گڈھ جامع مسجد کے درسِ قرآن کے ذریعہ ہوئی، جس آغاز اس طرح ہوا کہ ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۹۹۰ء میں بابو عزیز الرحمان صاحب مرحوم (سابق امام جامع مسجد) نے جمعیۃ علماے اعظم گڑھ کی ایک میٹنگ میں یہ تجویز رکھی کہ ...... حضرت مولانا سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ جب یہاں تشریف رکھتے تھے اور ان کی خدمت میں مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی علیہ الرحمہ رہا کرتے تھے، تو مولانا اویس صاحب نے جامع مسجد میں درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا تھا، مگر ان کے چلے جانے کے بعد یہ سلسلہ بند ہوگیا ...... اب دوبارہ اس بابرکت سلسلہ کو شروع ہونا چاہیے۔ مولانا عبد الرب صاحب اعظمی (جہانا گنج) اس میٹنگ میں شریک تھے، انھوں نے اس تجویز کی پُرزور تائید کی اور حضرت مولانا علیہ الرحمہ کا نام اس کے لیے پیش کیا۔ یہ بابو صاحب مرحوم کے اخلاص کی برکت تھی کہ اس کے بعد والے اتوار سے یہ مبارک سلسلہ شروع ہوا، اور مسلسل بغیر کسی نمائش وتشہیر کے تقریباً ۲۲؍سال تک ہر اتوار کو بعد نمازِ مغرب پون گھنٹہ سے ایک گھنٹہ تک یہ درس ہوتا رہا۔

اللہ تعالیٰ نے اسے قبول عام عطا فرمایا، اس میں شہر کے تعلیم یافتہ وغیر تعلیم یافتہ حضرات نہایت ذوق وشوق اور بڑے اہتمام سے شریک ہوتے رہے۔ ایک تو حضرت مولانا کا وفورِ علم اور وسعتِ معلومات، دوسرے ان کا مؤثر اور دل نشیں اندازِ بیان 'از دل خیزد بر دل ریزد' کا صحیح مصداق! جس نے ایک مرتبہ درس میں شرکت کر لی، پھر وہ ہر ہفتہ نہایت پابندی سے درس میں حاضر ہوتا۔ اس درس سے ماشاء اللہ لوگوں کی بہت اصلاح ہوئی، عقاید صحیح ہوئے، اعمال درست ہوئے، ظاہر و باطن میں تبدیلی آئی، لیکن کبھی اس کا خیال نہیں آیا کہ اس کو ضبط تحریر میں لا کر شائع کیا جائے، تا کہ اس کا فایدہ اور عام ہو۔ اسی

وقت چند ایک دروس ماہنامہ ضیاء الاسلام میں شائع ہوئے، لیکن اس کے جمع کرنے کا کوئی اہتمام نہیں ہوا۔ البتہ اخیر زمانے میں ان کے ریکارڈ کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تھا، جس میں سے کچھ ریکارڈنگ محفوظ ہے۔ مولانا کے وصال کے بعد جب عزیزی مولانا محمد عرفات سلّمہٗ نے مولانا کے چھوڑے ہوئے علمی اثاثے پر کام شروع کیا تو انھوں نے یہ تمام ریکارڈنگ اکٹھا کی اور ان کو سن کر تحریری شکل میں مرتب کرنا شروع کیا۔ اس کی پہلی جلد ابھی دو سال پہلے 'خطبات اعجاز' کے نام سے شائع ہو چکی ہے، جس میں مختلف مواقع پر کی گئی مولانا کی تقاریر ہیں۔ اس سلسلہ کی یہ دوسری جلد ان کے دوست عزیزی مولانا محمد اشہد اعظمی سلّمہٗ نے مرتب کی ہے، جو ایک صاحبِ ذوق عالم ہیں۔ اس جلد میں صرف قرآن کے دروس ہیں، چند آیتوں کو چھوڑ کر جو ریکارڈ ہونے سے رہ گئیں، مکمل سورہ احزاب کا درس ہے۔ یہ اس معنی کر بہت اہم ہے کہ حضرت مولانا اکثر سورہ احزاب اور سورہ حجرات کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ 'اس کو مطالعہ میں رکھنا چاہیے۔' چنانچہ اپنے ایک مکتوب میں بھی مجھے یہ بات لکھی ہے جو حدیث دوستاں میں چھپا ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ عزیز موصوف کو جزائے خیر دیں اور ان کے لیے اس سلسلے کی ترتیب و تالیف کو سہل و آسان فرمائیں اور شرف قبولیت سے نوازیں۔

ضیاء الحق خیرآبادی، ایڈیٹر مجلّہ 'رشد و ہدایت'
و مدرس دار العلوم تحفیظ القرآن، سِکھٹی، مبارک پور اعظم گڈھ
۸/ ذوقعدہ ۱۴۴۰ھ مطابق ۱۲/ جولائی ۲۰۱۹ء جمعہ

❑❑❑

درسِ قرآن

[جامع مسجد شہر اعظم گڑھ]

مومن ومنافق کا رویہ غزوۂ احزاب کی روشنی میں

الحمدلله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله وصحبه اجمعين۔

اَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآئَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا
عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَجُنُوْدًا لَمْ تَرَوْهَا وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا﴿۹﴾اِذْ جَآئُوْكُمْ مِنْ
فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ
بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا﴿۱۰﴾هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا﴿۱۱﴾وَاِذْ
يَقُوْلُ الْمُنَافِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَرَضٌ مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اِلَّا غُرُوْرًا
﴿۱۲﴾ وَاِذْ قَالَتْ طَآئِفَةٌ مِنْهُمْ يَا اَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا وَيَسْتَأْذِنُ
فَرِيْقٌ مِنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ وَمَاهِيَ بِعَوْرَةٍ اِنْ يُرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا
﴿۱۳﴾وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَآتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَا اِلَّا
يَسِيْرًا﴿۱۴﴾وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ
مَسْئُوْلًا﴿۱۵﴾ قُلْ لَنْ يَنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَاِذًا لَا

تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۶﴾ قُلْ مَنْ ذَا الَّذِیْ يَعْصِمُكُمْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْٓءًا اَوْ
اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً وَلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۷﴾ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ
الْمُعَوِّقِيْنَ مِنْكُمْ وَالْقَآئِلِيْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَيْنَا وَلَا يَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۸﴾
اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِیْ يُغْشٰى
عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ
اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۱۹﴾
يَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوْا وَاِنْ يَّاْتِ الْاَحْزَابُ يَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِی
الْاَعْرَابِ يَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْۢبَآئِكُمْ وَلَوْ كَانُوْا فِيْكُمْ مَا قٰتَلُوْٓا اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۲۰﴾ [سورہ احزاب]

اس سورہ (احزاب) کے شروع میں میں نے عرض کیا تھا کہ اللہ نے اس سورہ میں اپنے رسول کے حقوق بیان کیے ہیں۔یعنی صاحبِ ایمان کو آپ ﷺ کے ساتھ کس طرح کا معاملہ کرنا ہے، کس طور سے رہنا ہے، کیا طریقہ اللہ کو پسند ہے؟ اس کو بیان کیا ہے۔ پہلے رکوع میں ایک ایسی چیز کا بیان ہے جو اس وقت عربوں کے مزاج اور طریقے کے بالکل خلاف تھی، اس کو جناب نبی کریم ﷺ نے جاری فرمایا اور ان کی قدیم رسم کو توڑا۔

غلط رسم کا ازالہ نبی کا طریقہ ہے:

کسی قوم کے رسم و رواج کو توڑنا، وہ بھی ایسی رسم جو حلت و حرمت کی شان پیدا کیے ہو، ایک بہت مشکل کام ہے۔ برسوں لگ جاتے ہیں، بڑی محنت ہوتی ہے تب جا کر کہیں کسی رسم کا ازالہ ہو پاتا ہے۔ حضور ﷺ کے زمانے میں مدت سے ایک دستور چلا آرہا تھا کہ جب کوئی شخص کسی کو اپنا بیٹا بنا لیتا تو وہ حقیقی بیٹے کی طرح ہو جاتا۔ وراثت بھی اس کو ملتی اور باپ بیٹے میں رشتہ قائم ہونے کی وجہ سے جو حقوق و آداب ملحوظ ہوتے ہیں، وہ سب ہو جاتے، یہاں تک کہ اس منھ بولے بیٹے کی بیوی اس باپ کے اوپر حرام

ہوجاتی، حالاں کہ باپ بیٹے کا رشتہ منھ سے بولنے سے نہیں ہوتا۔ یہ صرف میاں بیوی کا رشتہ ہوتا ہے، یعنی منھ کے بول اور الفاظ کے ذریعہ جو رشتہ قائم ہوتا ہے، وہ نکاح کا رشتہ ہے۔ ایک عورت اجنبی الگ اور ایک مرد اجنبی الگ، دونوں اپنی رضا مندی کا اظہار کرتے ہیں اور نکاح ہوجاتا ہے۔ یہ صرف الفاظ کی وجہ سے ہوتا ہے، یہ رشتہ اسی تار سے بندھا ہوا ہے۔ آدمی کوئی دوسرا لفظ کبھی بول دیتا ہے کہ میں نے طلاق دیدی تو جو رشتہ برسوں سے بندھا ہوا تھا، وہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اب وہ اس کی بیوی نہیں رہی اور یہ اس کا شوہر نہیں رہا۔ کسی کا کسی پر کوئی حق نہیں رہا۔ باقی اور رشتے جیسے ماں باپ کا رشتہ ہے، بھائی بہن کا رشتہ ہے، تو یہ رشتہ ایسا نہیں ہے جو منھ کے بول سے قائم ہو، یہ خون سے قائم ہوتا ہے۔ اس کو کوئی توڑنا چاہے تو توڑ نہیں سکتا اور اگر کوئی اس کو بول کر پیدا کرنا چاہے تو پیدا نہیں کرسکتا۔ کسی نے کہہ دیا کہ یہ میرا بیٹا ہے تو یہ منھ کا بول ہے، بیٹا نہیں ہوگا۔ اور اگر کسی نے اپنے بیٹے کو کہہ دیا کہ یہ میرا بیٹا نہیں ہے، ہماری زبان میں کہتے ہیں کہ 'عاق' کردیا۔ عاق کا مطلب ہے کہ اب یہ میرا بیٹا نہیں ہے، میری وراثت نہیں پائے گا، مجھ کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ یہ تو خیر ہوسکتا ہے کہ آدمی کہے کہ مجھ سے کوئی مطلب نہیں ہے، مگر یہ ہے کہ اگر غلط طریقے سے کہے گا تو گنہ گار ہوگا۔ لیکن اس کہنے سے وہ وراثت سے محروم ہوجائے اور بیٹا نہ رہے، ایسا نہیں ہوسکتا۔ یہ رشتہ تو خون کے ذریعہ قائم ہوا ہے، خون نہیں بدلے گا۔ لہٰذا اگر کوئی سمجھتا ہے کہ وہ اس طرح اپنے بیٹے کو خارج کردے گا تو نہیں ہوسکتا یا کسی غیر کو اپنا بیٹا بنالے گا تو یہ بھی نہیں ہوسکتا۔

یہ رسم عربوں میں بہت پرانی تھی۔ دوسری رسم یہ تھی کہ بیوی سے دو ہی بات ہے یا تو نکاح کرے یا طلاق دیوے، تیسری اور کوئی چیز نہیں ہے۔ لیکن ایک تیسری چیز ان لوگوں نے بنا رکھی تھی کہ بیوی کو اپنی ماں سے تشبیہ دیتے تھے: أَنْتِ عَلَيَّ كَظَهْرِ أُمِّيْ۔ تم میرے لیے ایسی ہو جیسے کہ میری ماں کی پشت ہے۔ یعنی ماں کی پشت جیسے میرے لیے قابلِ احترام ہے اور میں اس کے ساتھ وہ معاملہ نہیں کرسکتا جو بیوی کے ساتھ کیا جاسکتا

ہے، اسی طرح تم بھی میرے لیے ہو۔ زمانہ جاہلیت میں اس کی وجہ سے بیوی ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی تھی۔ وہ گویا ماں بن جاتی تھی، اب اس بیوی کے اوپر انگلی نہیں رکھ سکتا۔ رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اللہ تعالی نے یہ دونوں رسمیں توڑیں۔ دونوں غلط رسمیں تھیں۔

صحابہ کرام کی شانِ امتثالِ امر:

اور صحابہ کرام نے اس کو قبول کیا، کسی کو اس پر کوئی اشکال نہیں ہوا۔ یہ لوگ متبع تھے، فرماں بردار تھے۔ جو کچھ زبانِ رسالت سے نکلتا تھا اس کو ماننے میں، اس کو قبول کرنے میں ایک لحظہ ان لوگوں کو سوچنا نہیں پڑتا تھا۔ حضور اکرم ﷺ رات میں معراج میں تشریف لے گئے۔ صبح میں لوگوں کو بتایا کہ میں راتوں رات یہاں سے بیت المقدس گیا اور وہاں نماز پڑھائی اور اس کے بعد ساتوں آسمان پر گیا تو کفار یہ سن کر ہنسنے لگے کہ 'لو صاحب! اب تو یہ روز نئی نئی بات گڑھتے ہیں، آج ایک نئی بات نکالی۔' انھوں نے سوچا کہ اس کے ذریعہ ہم مسلمانوں کو توڑ لیں گے کہ آپ کے صاحب ہر وقت ایک نئی بات کہتے ہیں، کہاں تک تم لوگ ان کا ساتھ دو گے؟ سب سے پہلے توڑنے کے لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے کہ یہی سب سے خاص تھے۔ کہا کہ 'آپ اپنے رسول کے ساتھ کہاں تک چلیں گے؟ کبھی کچھ کہتے ہیں اور کبھی کچھ۔ اب دیکھیے کہ کہہ رہے ہیں کہ رات میں مَیں آسمان پر گیا تھا، بھلا یہ ماننے کی بات ہے؟' تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اتنا تو پوچھا کہ 'کیا وہ واقعی یہ بات کہہ رہے ہیں؟' لوگوں نے کہا 'ہاں ہم سن کر آرہے ہیں۔' تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ 'تب ٹھیک ہے، اگر وہ کہہ رہے ہیں تو بالکل سچ ہے۔ واقعی ایسے ہی ہوا ہے جیسا وہ کہہ رہے ہیں۔' اب یہ ہکا بکا کہ ہم کیا سوچ کر آئے تھے اور یہ کیا ہو گیا؟ ہم تو کمزور کرنے کے لیے آئے تھے مگر یہ تو اور زیادہ مضبوط ہو گئے۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ 'ہم تو روز مانتے ہیں ہے ساتویں آسمان کے اوپر سے ان کے پاس جبریل آتے ہیں تو اب اگر جبریل ایک دن ان کو خود لے کر چلے گئے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟' اس قدر

بے تکلفی سے یہ بات تسلیم کرلی کہ اللہ کو ان کی یہ ادا پسند آگئی اور وہیں سے ان کا لقب صدیق پڑ گیا۔یعنی بہت زیادہ تصدیق کرنے والا۔

حضور اکرم ﷺ ایک بار ارشاد فرمارہے تھے کہ ’ایک شخص بیل کی پیٹھ پر بوجھ لادکر بار برداری کررہا تھا تو بیل نے گھوم کر انسانی زبان میں اس سے کہا کہ میں بوجھ لادنے کے لیے پیدانہیں ہوا ہوں، میں ہل جوتنے کے لیے پیدا ہوا ہوں۔‘تو بعض صحابہ کو تعجب ہوا......ایسانہیں ہے کہ ان کو تصدیق کرنے میں تکلف ہوا ہو......انھوں نے پوچھا کہ ’حضرت! بیل بول رہا تھا انسانی زبان میں؟‘ فرمایا ’ہاں بیل بول رہا تھا اوراس کی میں تصدیق کرتا ہوں اور ابوبکر وعمر اس کی تصدیق کرتے ہیں۔‘[صحیح بخاری:۲۳۲۴] یہ دونوں حضرات موجود نہیں تھے لیکن آپ ﷺ کو ان پر اتنا اعتماد تھا کہ کہہ دیا کہ یہ لوگ بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں اور مانتے ہیں۔

صحابہ کرام کی یہ شان تھی کہ جو حکم آیا پھر سوچا نہیں، بے تکلف اور بے دغدغہ مان لیا۔ایک حکم آیا کہ شراب حرام ہوگئی ہے۔لوگ شراب پی رہے تھے،شراب کے عادی تھے،شراب ہونٹوں سے لگی ہوئی تھی مگر جب معلوم ہوا کہ شراب کی حرمت نازل ہوگئی ہے تو جن کے ہونٹوں پر لگی ہوئی تھی، انھوں نے پھینک دی،جس کے پاس جتنی شراب تھی سب بہادی۔ یہ اطاعت مطلوب ہے۔

نبی کی شان امتیوں کے درمیان ایسی ہے کہ امتی کوئی چوں چرا سوچے ہی نا،بس یہ اطمینان ہو کہ نبی نے فرمایا ہے۔اگر نبی نے نہیں فرمایا اور کوئی کہے کہ ہم سے نبی نے فرمایا ہے تو وہ اپنے گھر جائے، ہم اس کی بات نہیں مانیں گے۔لیکن اگر نبی کا حکم ہے تو چاہے ہماری عقل کے وہ کتنی ہی خلاف بات ہو،اور چاہے ہمارے رسم ورواج کے کتنے ہی خلاف ہو، یہ سب رسم ورواج غلط،ہماری عقل کا سمجھنا غلط،رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے جو ارشاد ہوا ہے وہ غلط نہیں ہوسکتا۔پھر اسی کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لے۔

صحابہ کے امتثالِ امر کی شان یہ تھی کہ آپ لوگوں نے سنا ہوگا کہ 'ایک مرتبہ آپ ﷺ کسی جگہ گئے تو دیکھا کہ وہاں ایک اونچا سا مکان بنا ہوا ہے۔ پوچھا 'مکان کس کا ہے؟' بتایا گیا کہ 'فلاں صاحب کا ہے۔' کچھ بولے نہیں، واپس آ گئے۔ پھر وہی صحابی جن کا مکان تھا وہ آپ ﷺ کی مجلس میں آئے اور سلام کیا، آپ نے التفات نہیں فرمایا۔ ان کو کھٹک گیا کہ کچھ بات ہے؟ کسی سے پوچھا کہ 'کیا بات ہے، میں نے سلام کیا تو آپ ﷺ نے التفات نہیں فرمایا؟ آپ کا رخ کچھ بدلا سا محسوس ہوتا ہے۔' کہا کہ 'کوئی بات نہیں ہے، آپ ﷺ نے کچھ فرمایا تو نہیں ہے مگر اتنا ہوا ہے کہ تمھارے مکان کی طرف گئے تھے اور پوچھا تھا کہ کس کا مکان ہے؟' تو ان صحابی نے کہا 'اچھا یہ بات ہے، سمجھ میں آ گیا۔' اور پھر وہ بنا بنایا سارا مکان گرا دیا اور پھر حاضر خدمت ہوئے اور آ کر کچھ کہا نہیں، خاموش رہے۔ کچھ دنوں کے بعد پھر آپ کا اُدھر سے گزر ہوا تو پوچھا کہ 'مکان کیا ہوا؟' معلوم ہوا کہ گرا دیا۔

ایک صحابی ہیں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سرخ کپڑا پہن کر آئے۔ حضور ﷺ نے پوچھا کہ 'یہ کیا ہے؟ مردوں کے لیے اتنا لال کپڑا مناسب نہیں ہے۔' وہ کچھ بولے نہیں چلے گئے اور گھر پہنچ کر جلا دیا۔ واپس پھر حاضر خدمت ہوئے تو آپ نے پوچھا کہ 'کپڑا کیا ہوا؟' عرض کیا 'جلا دیا' آپ نے فرمایا کہ 'جلانے کی ضرورت کیا تھی؟ عورتوں کو دیدیے ہوتے۔' عرض کیا 'جو آپ کی نگاہوں سے گر گیا وہ اب اس لائق نہیں ہے کہ اس کو رکھا جائے۔'

یہ ان لوگوں کی شان تھی، ابرو کا اشارہ دیکھتے تھے کہ کیا چاہتے ہیں؟ پھر اس کے خلاف نہیں جاتے تھے، چاہے جی کی خواہش کچھ بھی ہو، رسم و رواج کچھ بھی ہو، چاہے دنیا کچھ بھی کہتی ہو۔

حضرت حذیفہ حضرت عمر کے زمانہ میں لشکر کے سردار تھے۔ ایک موقع پر دعوت ہوئی جس میں کفار کے بڑے بڑے سردار شامل تھے اور مسلمانوں کے بھی۔ حضرت

حذیفہ بیٹھے کھانا کھارہے تھے کہ ان کے ہاتھ سے ایک بوٹی زمین پر گرگئی۔انھوں نے بوٹی کو جلدی سے اٹھایا اور اسے صاف کر کے کھالیا۔کسی نے ان کو ٹوکا کہ ’حضرت! کیا کررہے ہیں؟ کفار کے سردار موجود ہیں، کیا کہیں گے کہ مسلمانوں کا سردار کیسا ہے کہ بوٹی گرگئی تو اسے اٹھا کر صاف کررہا ہے۔‘ حضرت حذیفہ نے کہا کہ ’میں ان دنیاداروں کی وجہ سے اپنے حبیب ﷺ کے طریقہ اور سنت کو نہیں چھوڑ سکتا۔حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو لقمہ تمھارے ہاتھ سے زمین پر گر جائے تم اسے اٹھا کر صاف کر کے کھالو۔‘

بزرگوں کی شانِ اتباعِ سنت اور اس کی برکت:

ہمارے بزرگوں میں حضرت تھانوی ایک مرتبہ ٹرین سے کہیں تشریف لے جارہے تھے۔اسی ٹرین میں حضرت کے ایک دور کے عزیز بھی تھے، مگر انگریزی لباس میں تھے۔حضرت کھانا کھانے بیٹھے تو ان کو بھی بلالیا۔گوشت تھا، وہ بھی شامل ہوگئے۔حضرت کے ساتھ خواجہ عزیز الحسن مجذوب بھی تھے، جو اس وقت ڈپٹی کلکٹر تھے۔اتفاق سے کھاتے ہوئے حضرت تھانوی کے ان عزیز کے ہاتھ سے ایک بوٹی گرگئی، تو انھوں نے اس کو اپنے بوٹ سے سیٹ کے اندر کردیا۔حضرت تھانوی پریشان ہوگئے اور خواجہ صاحب سے آہستہ سے فرمایا کہ ’ذرا وہ بوٹی اٹھانا۔‘ اٹھادیا، تو حکم دیا کہ ’اس کو دھودیجیے۔‘ دھودیا تو کہا کہ ’مجھے دیدیجیے تاکہ میں کھالوں۔‘ خواجہ صاحب نے عرض کیا کہ ’حضرت! آپ کو کھانا ضروری ہے یا کوئی اور بھی کھاسکتا ہے؟‘ کہا ’کوئی بھی کھاسکتا ہے۔‘ تو خواجہ صاحب نے اس بوٹی کو کھالیا۔یہ صاحب دیکھ رہے تھے مگر کچھ بولے نہیں۔ایک عرصہ کے بعد حضرت اپنی خانقاہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک صاحب آئے، خوب بڑی بڑی داڑھی، نورانی شکل وصورت والے۔حضرت نے ان کا استقبال کیا۔انھوں نے پوچھا کہ ’حضرت! آپ نے مجھے پہچانا؟‘ کہا ’نہیں، آپ کہاں کے ہیں؟‘ عرض کیا کہ ’میں وہی ٹرین والا ہوں جس سے بوٹی گری تھی تو بوٹ سے اندر کردیا تھا، اور آپ نے مجھ کو کچھ نہیں کہا اور اس کو دُھلوا کر کھالیا۔اس کا مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ اب میری زندگی بدل گئی اور آپ کے

پاس اس لیے آیا ہوں کہ آپ مجھے بیعت کرلیں۔

رسول اکرم ﷺ کا طریقہ کسی کی وجہ سے چھوڑا نہیں جا سکتا:

امت کا طریقہ یہی ہے کہ جب آپ ﷺ کی بات معلوم ہو جائے، بس اتنی شرط ہے کہ یہ حتمی طور سے معلوم ہو جائے کہ یہ آپ ہی کا ارشاد ہے، اس میں شبہ نہ ہو، تو اس کے بعد کسی چوں چرا کی گنجائش نہیں ہے۔ کرنا وہی ہے جو انھوں فرمایا ہے، کوئی مصلحت نہیں دیکھنی ہے اور نہ یہ سوچنا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے؟ ہم سے لوگ آکر کہتے ہیں کہ 'مولانا صاحب! کیا کریں، ہم بندوں کے درمیان رہتے ہیں۔' میں کہتا ہوں کہ 'جی آپ بندوں کے درمیان رہتے ہیں، مگر یہ ارشاد ہو کہ آپ اللہ کی نگاہ میں بھی رہتے ہیں یا نہیں؟ اگر رہتے ہیں تو پھر اللہ کا کتنا لحاظ کرتے ہیں؟' یہ کیا بات ہوئی کہ بندوں کا اتنا لحاظ اور اللہ کا بالکل نہیں۔ یہ زندگی کتنے دن ہے؟ اور یہ زندگی کس کام کی کہ اس میں آدمی غیروں کا لحاظ کرے اور اللہ کا نہ کرے۔ بندوں میں تو کوئی دم نہیں، کوئی طاقت نہیں ہے۔ نہ آپ کی روزی ان کے ہاتھ میں ہے، نہ آپ کی جان ان کے ہاتھ میں ہے، نہ آپ کا مال ان کے ہاتھ میں ہے۔ وہ کچھ بھی تو نہیں کر سکتے۔ پھر ان کی رعایت میں ان کے جیسا بننا کہاں تک صحیح ہے۔ ایک مسلمان یہ نہیں سوچتا، امت کا نبی کے ساتھ جو طرزِ عمل ہے وہ یہ نہیں ہے۔ نبی کے ساتھ طرزِ عمل جس کو اللہ دیکھنا چاہتا ہے اور جسے قرآن بیان کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ اگر ان کی طرف سے کوئی حکم آیا تو بڑی سے بڑی آزمائش ہو جائے، کوئی مسئلہ نہیں ہے، سب گوارا ہے۔ اور آزمائش ہی کے وقت تو آدمی کھلتا ہے۔ امتحان ہوتا ہے تبھی تو آدمی کھلتا ہے کہ وہ اپنے نفس کا ساتھ دے رہا ہے یا رسم ورواج کا ساتھ دے رہا ہے، غیروں کا لحاظ کر رہا ہے یا اللہ اور اس کے رسول کی تعلیم پر عمل کر رہا ہے؟

غزوۂ احزاب/ خندق:

یہ رکوع جو میں نے پڑھا ہے، اس میں اللہ تعالی نے جناب نبی کریم ﷺ کی سیرت کا ایک بہت ہی اہم حصہ بیان فرمایا ہے۔ اس رکوع میں غزوۂ خندق کا ذکر ہے۔

یہ غزوہ اتنا سخت تھا کہ اس موقع سے مومن ومنافق الگ الگ ہو گئے۔ اسلام کی پہلی جنگ بدر تھی اور دوسری احد تھی۔ پہلی میں مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا اور دوسری میں کفار غالب رہے۔ جنگ احزاب میں بیک وقت کفارِ مکہ اور یہودِ مدینہ دونوں سے لڑائی تھی۔ یہود مسلمانوں کو بہت تنگ کیا کرتے تھے، اللہ کا حکم آیا کہ ان سے مقابلہ کرو۔ چنانچہ حضور ﷺ نے ان کا محاصرہ کرلیا۔ یہودیوں نے کہا کہ 'ہمیں چھوڑ دیں، ہم چلے جائیں گے۔' آپ ﷺ نے فرمایا 'ٹھیک ہے، جاؤ۔' یہ سب اپنا بوریا بستر لے کر چلے گئے۔ مگر اس جانے کا انتقام ان کے سینے میں سلگتا رہا۔ کچھ عرصہ کے بعد ان لوگوں نے یعنی غزوۂ احد کے ایک سال کے بعد ۴ھ میں سازشیں شروع کیں اور مختلف قبائل کے پاس گئے، خاص طور سے ان لوگوں کے پاس جو لڑنے والے اور بہادر تھے۔ اور کہا کہ 'اگر اس طرح صرف ایک قبیلہ یا صرف مکہ والے مسلمانوں سے لڑیں گے تو کام نہیں چلے گا۔ ایسا کرو کہ سب لوگ ایک ہو جاؤ، ایک اتحادی مورچہ بنالو، پھر سب مل کر لڑو، ہم بھی تمھارے ساتھ ہیں۔' اس وقت یہودیوں کا ایک قبیلہ بنوقریظہ مدینہ میں رہ گیا تھا، ان سے مسلمانوں کا معاہدہ تھا، اُن کے بارے میں یقین دلایا کہ 'ہم لوگ اس قبیلہ کو مسلمانوں سے توڑ کر اپنے سے ملا لیں گے۔ مدینہ کے باہر سے تم لوگ یلغار کرنا اور اندر سے وہ لوگ حملہ کریں گے۔ اس طرح مدینہ سے مسلمانوں کو ختم کر دیا جائے گا۔' چنانچہ ان کے بہکاوے میں آ کر مختلف قبیلے لڑائی کے لیے تیار ہو گئے۔ اتحادی مورچہ کے پاس تقریباً دس ہزار کی فوج تھی۔ ابھی تک اتنی بڑی فوج سے مسلمانوں کا مقابلہ نہیں ہوا تھا۔ غزوۂ احد میں تین ہزار تھے اور غزوۂ بدر میں ایک ہزار آئے تھے۔

حضور ﷺ کو معلوم ہوا کہ ایک بڑا لشکر لڑائی کے ارادے سے آ رہا ہے۔ یہ شوال ۵ھ کی بات ہے۔ ۳ھ کے بعد سے مسلسل یہ لوگ تیاری کر رہے تھے۔ لشکر بہت بڑا تھا، اس لیے آپ ﷺ نے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے؟ ایک طرف حدیبیہ کے باغات وغیرہ تھے، اور ایک طرف راستہ کھلا تھا۔ یہ اندیشہ تھا کہ اِس طرف سے آئیں گے۔ حضرت

سلمان فارسی نے مشورہ دیا کہ 'حضرت! جب ہم لوگوں کے یہاں کبھی ایسی صورت پیش آتی اور دفاع کی طاقت نہیں ہوتی یا کم ہوتی تو بڑی سی خندق کھود دی جاتی۔ اُس پار دشمن کا لشکر ہوتا اور اِس پار ہم لوگ۔ وہ اِس پار نہیں آسکتے اور ہم خندق کی حفاظت کرتے رہتے۔' حضور ﷺ کو یہ رائے پسند آئی اور آپ نے لوگوں کو خندق کھودنے پر مامور کیا۔ یہ وہ وقت ہے جب مسلمانوں میں غربت بہت تھی، غلہ کی گرانی بہت تھی اور مسلمانوں کے پاس ابھی کوئی آمدنی کا ذریعہ ٹھیک سے نہیں ہو پایا تھا۔ ایسی صورتِ حال میں آپ نے سب کو خندق کھودنے پر لگا دیا اور آپ کے فرمان کی وجہ سے بے چوں و چرا سب لوگ لگ گئے۔ پیٹ پر پتھر بندھ رہے ہیں، بھوک کی وجہ سے پریشان ہیں، مگر یہ خیال نہیں آتا کہ چھوڑ کر چلے جائیں اور کہیں جا کر کھانے کا انتظام کریں۔ ڈھائی سو فٹ لمبی خندق کھودی گئی اور اتنی چوڑی کہ اُدھر سے آنہ سکیں۔ عرب کی پتھریلی زمین کو کھودنا آسان نہیں تھا، مگر یہ حضرات لگے رہے، دن رات لگے رہے یہاں تک کہ خندق تیار ہو گئی۔ اب جب اُدھر سے کفار آئے اور دیکھا کہ راستہ نہیں ہے تو خندق کے اُس پار پڑاؤ ڈال دیا۔ مسلمانوں کی پشت پر پہاڑ تھا۔

بہت سخت وقت تھا، ایک تو غربت بہت تھی اور پھر کفار نے محاصرہ کرلیا تھا۔ ادھر یہودیوں نے بنی قریظہ کو پھوڑ لیا تھا، یہ اندر تھے، اِن سے بھی ہر دم خطرہ لگا رہتا تھا۔ حضور ﷺ نے ایک بڑی قلعہ نما عمارت میں عورتوں کو رکھ دیا اور اس پر پہرہ لگا دیا۔ اس لیے کہ یہودیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا کہ کب کیا کریں گے؟ پھر موسم سرما آ گیا، شدید ٹھنڈک پڑنے لگی۔ ایک طرف بھوک کی وجہ سے فاقہ کشی اور دوسری طرف ٹھنڈک بہت زیادہ ہو گئی، اس پر سے بارش بھی ہونے لگتی۔ مدینہ شریف میں جب بارش ہو جاتی ہے تو سردی بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ کئی ایک آزمائشیں اور مسائل تھے، مگر عام لوگ مطمئن تھے کسی کو کوئی پرواہ نہیں تھی۔

تکلیف اتنی تھی کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ معرکہ میں تھے، اُدھر سے کفار تیر

برسا رہے تھے اور اِدھر سے مسلمان جواب دے رہے۔ اتنا سخت معرکہ تھا کہ اُس دن آپ کی تین نمازیں قضا ہوگئیں۔ موقع ہی نہیں ملا نماز پڑھنے کا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مورچہ سنبھالے ہوئے تھے، جب ذرا سا موقع ملا، رات ہوگئی تب حضرت عمر حضور ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ 'حضرت ! اللہ ان کافروں کی قبر کو آگ سے بھر دے، آج تو ان لوگوں نے اتنا پریشان کیا کہ میں تو نہ ظہر پڑھ سکا نہ عصر اور نہ مغرب، اور اب عشا کا وقت ہوگیا ہے۔' اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ 'تم اکیلے نہیں ہو، ہم سب بھی اس میں شامل ہیں۔ ہم بھی تینوں نمازیں نہیں پڑھ سکے۔ اچھا چلو قضا ہوگئی ہے تو قضا پڑھ لیتے ہیں۔' پھر سب لوگوں نے وضو کیا اور جماعت کے ساتھ تینوں نمازیں پڑھیں، اس کے بعد عشا کی نماز ادا کی۔

یہ صورت حال تھی اور اس صورت حال میں کفار نے ایک مہینے تک محاصرہ کیے رکھا۔ مگر کسی ایمان والے کو کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ ہاں جو نہیں مانتے تھے، جن کو منافق کہا جاتا ہے، ان کی طرف سے بڑے مسائل پیدا ہوئے۔ اور اللہ نے واضح فرمادیا کہ جو رسول کے ساتھ اِس طرح یعنی صحابہ کرام کی طرح رہے گا، وہ واقعی صاحبِ ایمان ہے اور جو اِس طرح نہیں رہے گا وہ منافق ہے۔

اس رکوع کے اندر اللہ تعالی اس جنگ کی تفصیلات کو اور اپنی رحمت کو بیان کیا ہے۔ فرمایا: يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا۔ اے ایمان والو! یاد کرو اللہ نے اس وقت تم پر کیسا انعام کیا جب تم پر بہت سے لشکر چڑھ آئے تھے، پھر ہم نے ان پر ایک آندھی بھی بھیجی تھی اور ایسے لشکر بھی جو تمھیں نظر نہیں آتے تھے۔ اور تم جو کچھ کر رہے تھے، اللہ اس کو دیکھ رہا تھا۔ [ترجمہ از آسان ترجمہ قرآن]

آندھی کا واقعہ:

اس آیت میں ہوا یعنی آندھی بھیجنے کا ذکر ہے۔ اس کا واقعہ یہ ہوا تھا کہ آخری

دنوں میں جب کہ بہت زیادہ تنگی آ گئی تھی، تو اللہ نے ایک ہوا بھیجی، اس میں بڑی آواز تھی۔ وہ ہوا جب چلی تو کفار کے تمام خیمے الٹ گئے، ہانڈیاں الٹ گئیں، آگ جلانا مشکل ہوگیا۔ پریشان ہوگئے، نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی ہوا اُکھڑ گئی۔ مسلمانوں کو جنگ نہیں کرنی پڑی، بس دفاع کافی ہوگیا اور وہ بھاگ نکلے۔

حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ 'میں نے اتنا سخت دن کبھی نہیں دیکھا۔ اتنی ٹھنڈک تھی اور اتنی تیز اور سرد ہوا چل رہی تھی کہ کپکپی کی وجہ سے سب لوگ پریشان تھے۔ جس کے پاس جو کپڑا تھا، اُسی میں لپٹا پڑا تھا۔ اور تھکان اتنی تھی کہ ہلنے کی ہمت نہیں ہورہی تھی۔ حضور اکرم ﷺ نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ کا رنگ ہی کچھ اور تھا، سب لوگ پریشان اور تھکن سے سورہے ہیں اور حضرت نماز پڑھ رہے ہیں، اللہ کے سامنے حاضر ہیں۔ نماز پڑھتے پڑھتے تھوڑی دیر کے بعد فرمایا کہ 'کوئی تم میں سے جاگ رہا ہے؟ اگر کوئی جاگ رہا ہو تو جا کر کفار کی خبر لائے، اس کے لیے بشارت ہے کہ وہ کل قیامت کے دن میرے ساتھ رہے گا۔' حضرت حذیفہ کہتے ہیں کہ 'کسی نے سنا کہ نہیں سنا، مگر میں نے سنا۔ ٹھنڈک اور تھکان اتنی زیادہ تھی کہ ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔' پھر آپ نے نماز شروع کردی، سلام پھیرنے کے بعد پھر فرمایا کہ 'کوئی جاگ رہا ہے؟ اگر جاگ رہا ہے تو جا کر کفار کی خبر لاوے، اس کے لیے بشارت ہے کہ وہ کل قیامت کے دن میں میرے ساتھ ہوگا۔' مگر اب بھی ہمت نہیں پڑی۔ تیسری مرتبہ آپ نے فرمایا 'یا حذیفہ!' جب میرا نام لے کر پکارا تو میں فوراً اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ فرمایا کہ 'جاؤ! کفار کا پتا لگاؤ کہ کس حال میں ہیں؟' اور آپ نے ان کے لیے دعا فرمائی اور ان کے بدن پر ہاتھ پھیر دیا۔ وہ جانے لگے تو پھر بلایا اور فرمایا کہ 'جاؤ! صرف دیکھ کر آنا، کچھ کر کے مت آنا۔' حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ 'میں چلا تو آپ کی دعا کی برکت یہ ہوئی کہ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں بھٹی میں چل رہا ہوں، پسینہ ہونے لگا، ٹھنڈ کا کوئی نام ونشان نہیں۔ میں بڑے آرام سے چلا جارہا ہوں۔ خندق ڈھائی میل تھی اور ظاہر ہے کہ کود کر نہیں جایا جاسکتا تھا۔ اُس پار

جانے اور واپس آنے میں وقت تو لگے گا ہی۔ فرماتے ہیں کہ میں وہاں گیا تو دیکھا کہ سب آگ جلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک جگہ تھوڑی سی آگ جل رہی ہے۔ ایک موٹے سے کالے آدمی کو دیکھا کہ وہ اپنا پہلو اور پیٹھ سینک رہا تھا۔ میں درمیان میں جا کر بیٹھ گیا۔ لشکر کا سردار ابوسفیان بھی تھا۔ ابوسفیان کو فوراً شبہ ہوگیا، اس نے کہا کہ 'تم لوگ دیکھ لو، تمھارے درمیان کوئی دوسرا آدمی تو نہیں آگیا؟' اندھیرا تھا تھوڑی سی آگ جل رہی تھی۔ حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ 'میں ہی پکڑا جاتا، اس لیے کہ میں ہی دوسرا آدمی تھا۔' تو میں نے جلدی سے ایک آدمی کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا کہ 'تم کون ہو؟' جب اطمینان ہوگیا کہ کوئی غیر نہیں ہے تب ابوسفیان نے کہا کہ 'دیکھ رہے ہو تم لوگ! آندھی اتنی تیز چل رہی ہے، ٹھنڈک اتنی زیادہ ہے، قریظہ والوں نے ہمیں دھوکہ دیا ہے اور یہ لوگ ہمیشہ دھوکہ دیتے ہیں۔ جلدی نکل چلو، یہاں رُکو مت۔' سب جلدی جلدی اٹھنے لگے۔ حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ 'میرے جی میں آیا کہ ابوسفیان کی گردن میرے نشانہ پر ہے اور کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہے، گردن اڑا دوں، مگر اچانک خیال آیا کہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ 'کچھ کر کے مت آنا' بس یہ خیال آنا تھا کہ وہیں ٹھہر گئے اور تیر کمان سے ہاتھ ہٹالیا۔'

یہ ہے اپنے جذبات اور جوش کو دبا لینا۔ حضور ﷺ کی بات سب سے پہلے، آپ نے فرمادیا کہ کچھ کرنا مت، تو اتنا اچھا موقع چھوڑ دیا مگر آپ کی بات سے ہٹے نہیں۔

حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ 'میں واپس چلا ہوں اور خندق جہاں سے مجھے پار کرنی تھی، اس کے قریب پہنچا ہوں تو مجھے بارہ چودہ آدمی ملے۔ بڑی بڑی پگڑیاں باندھے آ رہے تھے، میرے لیے بالکل اجنبی تھے۔ مجھ سے کہا کہ 'جاؤ اپنے صاحب سے کہہ دینا کہ اب کام ختم ہوگیا، اب یہ سب بھاگیں گے، اللہ کی طرف سے مدد آچکی ہے۔' وہ سن کر چلے آئے، اور جب حضور ﷺ کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ ابھی بھی آپ نماز میں مشغول ہیں۔ حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ 'عجیب بات یہ ہوئی کہ مجھے ابھی تک گرمی کا احساس ہو رہا تھا، مگر جیسے ہی میں حضور ﷺ کے سامنے پہنچا تو پھر ٹھنڈک لگنے لگی، میں

کانپنے لگا۔حضور ﷺ نے نماز ہی میں اشارہ کیا تو میں جا کر حضور ﷺ کے قدموں میں سو گیا اور جو چادر اوڑھ کر آپ نماز پڑھ رہے تھے، وہ آپ نے میرے اوپر ڈال دی۔سلام پھیرا تو مجھ سے مخاطب ہوئے۔میں ساری باتیں جو دیکھی تھیں بتلا دیں۔فرمایا ٹھیک ہے اور پھر نماز میں مشغول ہو گئے۔ جب فجر کا وقت ہو گیا تو مجھ سے فرمایا کہ 'اے نومان! جلدی اٹھ!' عربی میں نومان کے معنی سونے والا۔پھر اس کے بعد آپ نے سب کو جگایا اور فجر کی نماز پڑھی گئی۔آپ ایک منٹ بھی نہیں سوئے، پوری رات جاگتے رہے اور نماز پڑھتے رہے۔

یہ تھی صحابہ کرام کی شانِ اطاعت۔کہہ دیا جاؤ، تو بے تکلف جانے لگے، کہہ دیا کہ کچھ کر کے مت آنا تو بہترین موقع سب سے بڑے دشمن کو قتل کرنے کا چھوڑ دیا۔اگر قتل کرتے تو اللہ جانے دوسری جگہ کتنا انعام ملتا،مگر فرما دیا کہ کچھ کرنا مت ،تو کچھ نہیں کیا۔مومن کی یہ شان ہوتی ہے۔ہمارے جی و جذبات کے خلاف ہو یا موافق ، نبی کا حکم آ گیا تو بس وہی رہے گا۔

اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ : فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا۔ہم نے کفار کے اوپر ہوا بھیجی اور ایسا لشکر بھیجا جس کو تم نے نہیں دیکھا۔ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ۔اور جو کچھ تم کر رہے تھے، ہم دیکھ رہے تھے۔اللہ تعالی اہل ایمان سے فرماتے ہیں کہ جو فرماں برداری تم نے کی، جو اطاعت کی اور جو قربانی دی، ہم اسے دیکھ رہے تھے۔اور تم سے خوش ہو کر ایک ایسا لشکر بھیجا جس کو کوئی نہیں دیکھ سکا، اور اس لشکر نے تمھاری مدد کی۔

جب کفار کا لشکر آ رہا تھا تو کیا حال تھا؟ اللہ تعالی فرماتے ہیں اور اللہ سے بڑھ کر کون سچا ہو سکتا ہے؟ فرماتے ہیں: إِذْ جَآءُوكُم مِّن فَوْقِكُمْ جب وہ تمھارے پاس آئے تمھارے اوپر سے۔اوپر سے کا مطلب یہ ہے کہ مدینہ سے شرق کی طرف عوالی کا علاقہ تھا۔وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ اور تمھارے نیچے سے۔یعنی پچھّم کی طرف سے۔دونوں

طرف سے لشکر آ رہا تھا، ایک طرف یہودیوں کا لشکر تھا اور دوسری طرف کفار کا۔ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ اور جب نگاہیں اِدھر اُدھر ہونے لگیں خوف کی وجہ سے اور دل حلق تک آ گئے تھے۔ جب صدمہ ہوتا ہے یا گھبراہٹ ہوتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے دل حلق تک آ گیا ہو۔ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا اور تم کو اللہ کے بارے میں طرح طرح کا گمان ہونے لگا تھا۔ یہ گمان ان لوگوں کو ہونے لگا تھا جو کہلاتے مسلمان ہی تھے، مگر ان کا دل ایمان سے خالی تھا۔ زبان سے چوں کہ وہ مسلمان ہونے کا اقرار کرتے تھے، اس لیے ظاہر سی بات ہے کہ بہت سے لوگ اُن کو بھی اہل ایمان میں شمار کرتے تھے۔ اس لیے ان کو بھی اسی شمار میں رکھ کر یہ بات کہی گئی ہے۔ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ وہاں پر ایمان والے جانچے گئے کہ کون پکا مومن ہے اور کون کچا؟ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا۔ اور بہت جھڑ جھڑائے گئے اور بہت تکلیف میں ڈالے گئے۔ وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنَافِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَرَضٌ مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ اِلَّا غُرُوْرًا۔ اور جب منافقین کہہ رہے تھے اور وہ لوگ جن کے دلوں میں مرض ہے، اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدہ کیا سب غلط معلوم ہوتا ہے۔

منافقین کی دوہری پالیسی:

منافقین کہہ رہے تھے کہ ابھی خندق کھودتے وقت یہ کہہ رہے تھے کہ ہم کسریٰ کا محل دیکھ رہے ہیں، ہم قیصر کا محل دیکھ رہے ہیں، ہم مصر کا محل دیکھ رہے ہیں۔ سب میرے قدموں میں آیا ہے۔ اتنا اونچا خواب اور اتنا بڑا وعدہ کر رہے تھے، اور اب حال یہ ہے کہ کھانے کے لالے پڑ گئے ہیں۔ یہ سب وعدے دھوکا معلوم ہوتے ہیں۔

وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يَا اَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا اور انھیں منافقین میں سے ایک گروہ کہہ رہا تھا کہ اے مدینہ والو! تمھارا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے، لا کر پھنسا دیا ہے، بھاگو یہاں سے۔ ایک دوسرے سے یہ کہہ کر پھوڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور خود ان کا حال یہ تھا کہ: وَيَسْتَأْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ

نبی سے آ کر کہتے تھے کہ ہمارا گھر خالی پڑا ہوا ہے، کوئی ہے نہیں، پتا نہیں کب کوئی چور اُچکا آ جائے اور ہمارے گھروں کو لوٹ لے۔ اس لیے ہم کو چھٹی دیدیجیے، ہم گھر جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ إِنْ يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا۔ وہ بالکل کھلے ہوئے نہیں تھے، سب کی حفاظت کا بندوبست تھا۔ یہ بھاگنے کا ارادہ کر چکے تھے۔

یہ بزدل لوگ تھے، ان کے پاس ایمان نہیں تھا، ان کو رسول اللہ ﷺ پر یقین نہیں تھا، اس لیے بھاگنے کی اجازت مانگ رہے تھے۔ اور ان کا حال یہ ہے کہ: وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِنْ أَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَآتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوا بِهَا إِلَّا يَسِيرًا۔ اگر مدینہ کے اطراف سے یہ کفار گھس جاتے اور مدینہ میں گھس کر ان سے فساد میں شامل ہونے کو کہتے تو یہ فوراً ان کے ساتھ شامل ہو جاتے اور اس وقت وہ اپنے گھروں میں تھوڑی دیر بھی نہیں ٹھہرتے۔ بات یہ ہے دل میں ایمان نہیں ہے، صرف زبان سے ایمان کا اظہار کرتے ہیں۔ وَلَقَدْ كَانُوا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّونَ الْأَدْبَارَ۔ حالاں کہ اس سے پہلے انھوں نے اللہ سے معاہدہ کیا تھا کہ اب پیٹھ پھیر کر کبھی نہیں بھاگیں گے۔

غزوۂ احد میں منافقین تین سو شامل تھے، مسلمانوں کا لشکر بشمول ان کے ایک ہزار تھا۔ جب لشکر چلا اور پہاڑی کے قریب پہنچا ہے تو تین سو جو منافق تھے، انھوں نے کہا کہ ہمارے بس کا نہیں ہے کہ ہم لڑیں۔ چنانچہ وہ واپس ہو گئے۔ اب سات سو کا لشکر رہ گیا۔ غزوۂ احد کے بعد جب اُن پر عتاب پڑا ہے تو اس وقت ان لوگوں نے معاہدہ کیا کہ اب ان شاء اللہ اگر لڑائی ہوگی تو ہم پیچھے نہیں ہٹیں گے، اب ساتھ ساتھ رہیں گے۔ بہت وعدہ وعید کیا مگر پھر جب موقع آیا تو بھاگنے کی کوشش کرنے لگے، بہانے بازی شروع کر دی۔ اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: وَلَقَدْ كَانُوا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّونَ الْأَدْبَارَ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْئُولًا۔ اس سے پہلے انھوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ پیٹھ پھیر کر نہیں ہٹیں گے، اور اللہ سے عہد ذمہ داری کی چیز ہوتی ہے، اس کی پوچھ ہوگی۔

قُلُ لَنُ یَنُفَعَکُمُ الُفِرَارُاِنُ فَرَرُتُمُ مِنَ الُمَوُتِ اَوِ الُقَتُلِ۔ ان سے کہہ دو کہ تمھارا بھاگنا تم کو کچھ فایدہ نہیں دے گا اگر تم موت سے بھاگ رہے ہو یا قتل سے بھاگ رہے ہو۔ اگر موت سے بھاگ رہے ہو تو موت آئے گی، اور اگر قتل سے بھاگ رہے تو بھی کوئی فایدہ نہیں، جس کی قسمت میں یہی لکھا ہو کہ وہ قتل کیا جائے گا تو اپنے گھر میں بھی قتل ہو جائے گا۔ وَاِذًا لَا تُمَتَّعُوُنَ اِلَّا قَلِیُلًا۔ اور تم نہیں پاؤ گے فایدہ اٹھانے کو مگر تھوڑے دن۔

قُلُ مَنُ ذَا الَّذِیُ یَعُصِمُکُمُ مِنَ اللّٰہِ اِنُ اَرَادَ بِکُمُ سُوۡءًا اَوُ اَرَادَ بِکُمُ رَحُمَۃً۔ تم کہہ دو کہ کون ہے جو تم کو بچائے اللہ سے۔ اگر اللہ تم کو کسی تکلیف میں ڈالنا چاہیں یا تم پر کوئی مہربانی فرمانا چاہیں، سب اللہ کے اختیار میں ہے۔ اگر تکلیف کا فیصلہ کر لیا تو کون روک سکتا ہے؟ اور اگر مہربانی کرنا چاہیں تو اس سے کون روک سکتا ہے؟ وَلَا یَجِدُوُنَ لَھُمُ مِنُ دُوُنِ اللّٰہِ وَلِیًّا وَلَا نَصِیُرًا۔ اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور کوئی مددگار نہیں ہے۔

قَدُ یَعُلَمُ اللّٰہُ الُمُعَوِّقِیُنَ مِنُکُمُ وَالُقَآئِلِیُنَ لِاِخُوَانِھِمُ ھَلُمَّ اِلَیُنَا۔ بے شک اللہ کو معلوم ہے ان لوگوں کے بارے میں جو روکنے والے تھے۔ چپکے سے کانوں میں پھونکا کرتے تھے کہ مت جاؤ، پریشان ہو جاؤ گے۔ اور وہ لوگ جو کہتے ہیں اپنے بھائیوں سے ہمارے پاس چلے آؤ۔ کہاں ان کے ساتھ جا رہے ہو؟ پتا نہیں کہاں یہ لے جا کر پھنسا رہے ہیں؟ وَلَا یَاۡتُوُنَ الُبَاۡسَ اِلَّا قَلِیُلًا۔ اور لڑائی میں نہیں آتے مگر تھوڑے تھوڑے۔

اَشِحَّۃً عَلَیُکُمُ۔ تمھارے اوپر یہ بہت بخیل ہیں۔ یعنی تمھاری کوئی مدد نہیں کرنا چاہتے، تم سے الگ رہنا چاہتے ہیں۔ فَاِذَا جَآءَ الُخَوُفُ رَاَیُتَھُمُ یَنُظُرُوُنَ اِلَیُكَ تَدُوُرُ اَعُیُنُھُمُ کَالَّذِیُ یُغُشٰی عَلَیُهِ مِنَ الُمَوُتِ۔ جب کوئی خوف کی چیز آتی ہے، کوئی مقابلہ درپیش ہوتا ہے تو تم ان کو دیکھتے ہو کہ وہ ایسے دیکھتے ہیں کہ گویا ان کی آنکھیں گھومتی رہتی ہیں، جیسے موت کا سناٹا ان پر چھا گیا ہو۔ اتنا ڈر جاتے ہیں کہ آنکھیں ڈگر ڈگر کانپنے

لگتی ہیں، جیسے موت کی بے ہوشی ان پر آ گئی ہو۔ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ۔ لیکن جب خوف ختم ہو جاتا ہے تو تمھارے سامنے مال کی حرص میں تیز تیز زبانیں چلاتے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا۔ یہ لوگ ایمان والے نہیں ہیں چاہے یہ جتنا کہیں کہ ہم مومن ہیں ۔اللہ نے ان کے اعمال ختم کردیے۔ جب ایمان ہی نہیں ہے تو پھر کسی عمل کی کوئی قیمت بھی نہیں ہوگی۔ اور اللہ کے لیے یہ آسان ہے۔

يَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوْا۔ منافقین یہ گمان کرتے ہیں کہ لشکر ابھی گیا نہیں ہے۔ یعنی کفار کا لشکر جو آیا تھا ابھی گیا نہیں ہے۔ وَاِنْ يَّاْتِ الْاَحْزَابُ يَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِي الْاَعْرَابِ۔ اور اگر لشکر آ جائے تو یہ چاہیں گے کہ دیہاتوں میں بھاگ جائیں۔ اور وہیں بیٹھ کر پوچھا کریں کہ مسلمانوں کا کیا حال ہے؟ یعنی کسی طریقہ سے یہ تمھارا ساتھ دینے والے نہیں ہیں۔ يَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْبَآئِكُمْ ۔ وہ تمھاری خبروں کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں۔ وَلَوْ كَانُوْا فِيْكُمْ مَا قَاتَلُوْا اِلَّا قَلِيْلًا۔ اور اگر تمھارے درمیان ہوں تو لڑائی میں نہیں جائیں گے بھاگیں گے بہت کم لڑائی میں شامل ہوں گے۔

مطلب یہ ہے کہ یہ منافقین کا شیوہ ہے کہ نبی کوئی بات کہیں اور کسی چیز کی دعوت دیں تو بھاگ لیں اور اپنی مصلحتیں بتائیں کہ صاحب! میرا گھر کھلا ہے، میرے فلاں بیمار ہیں۔ ایمان والوں کی شان یہ ہے کہ نبی کا حکم آ گیا تو پھر کچھ سوچنا نہیں ہے۔ سب سے پہلے ان کی بات اور ان کا حکم پورا ہونا چاہیے۔ اور یہی عین ایمان ہے، یہی عین اسلام ہے اور یہی عین مذہب ہے۔ اسی لیے ہمارے علما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اطہر عینِ اسلام ہے، عینِ دین ہے۔ اور یہ قرآن سے بھی ثابت ہوتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۔[نساء:۸۰] جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ اور جو رسول کی اطاعت نہیں کرے گا وہ اللہ کی اطاعت کرنے والا نہیں ہوگا۔ اگر کوئی رسول کے طریقہ سے ہٹ جائے تو وہ اللہ کا فرماں

بردار بندہ نہیں ہے۔

بہرحال! نبی کے ساتھ مسلمانوں کو کیسے رہنا چاہیے؟ اللہ تعالی نے بتایا۔ اور ایک منافق کیا رویہ اختیار کرتا ہے وہ بھی بتایا۔ اب اس کی روشنی میں ہم کو اپنے اعمال و اخلاق کا احتساب کرنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ ہمارے اندر کون سی صفت زیادہ ہے۔ آیا ہم اپنے اعمال و اخلاق کے اعتبار سے مخلص مسلمان ہیں یا منافق مسلمان ہیں۔

اللہ تعالی ہم سب کو صحیح ایمان اور صحیح سمجھ کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

❑❑❑

درسِ قرآن

[جامع مسجد شہر اعظم گڑھ]

اہل ایمان کے لیے صرف ایک ہی اسوہ ہے

الحمدلله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله وصحبه اجمعين۔

اَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿۲۱﴾ وَلَمَّا رَاَى الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِيْمَانًا وَتَسْلِيْمًا ﴿۲۲﴾ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾ لِيَجْزِىَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَحِيْمًا ﴿۲۴﴾ وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ﴿۲۵﴾ وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ﴿۲۶﴾ وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرًا ﴿۲۷﴾ [الاحزاب]

اس سے پہلے رکوع میں غزوۂ احزاب جسے غزوۂ خندق بھی کہتے ہیں، کا تفصیلی بیان تھا، اوراس میں منافقین نے دھوکا دہی کا جوطرزِعمل اختیار کیا تھا، اس پر تنبیہ تھی۔ اس رکوع میں اسی غزوہ سے متعلق جوخاص اہل ایمان ہیں، ان کا تذکرہ ہے۔ اور جیسا کہ میں نے شروع ہی میں عرض کیا تھا کہ اس سورہ میں خاص طور سے اس کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ امت کو کیسا معاملہ رکھنا چاہیے۔ چنانچہ اسی بیان کو محور اور اصول بنا کر اللہ تعالیٰ نے باقی باتیں بیان فرمائی ہیں۔

اسوہ کا مطلب:

چنانچہ فرماتے ہیں: لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ ۔ اسوہ کے معنی آتے ہیں نمونہ کے۔ نمونہ دونوں طرح کا ہوتا ہے، اچھا بھی اور برا بھی۔ آدمی آدمی کو دیکھ کر ہی چلتا ہے۔ ہر آدمی کسی نہ کسی نمونہ پر عمل کرتا ہے۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو ابتدا میں اپنے ماں باپ کو دیکھتا ہے، وہی اس کے لیے نمونہ ہوتے ہیں، اور وہ ان کے طریقہ پر چلتا ہے۔ کچھ ہوش وحواس آتا ہے، کچھ ذہن بنتا ہے تو پھر باہر بھی کچھ نمونے ملتے ہیں۔ پھر کوئی اچھا لگتا ہے تو اس کے مطابق آدمی اپنے کو ڈھال لیتا ہے۔ کسی کا کپڑا اچھا لگا، کسی کی سواری اچھی لگی، کسی کا مکان اچھا لگا، کسی کی صورت اچھی لگی، کسی کی بات چیت اچھی لگی تو آدمی کبھی شعوری طور پر اور کبھی غیر شعوری طور پر اسی رنگ میں ڈھلتا چلا جاتا ہے۔

شیخ الاسلام حضرت مدنی کا اسوۂ نبوی پر عمل:

مجھے اس موقع پر حضرت مولانا حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ کی ایک ادا یاد آرہی ہے۔ حضرت مولانا کو اللہ نے جو علمی وعملی کمالات دیے تھے وہ تو تھے ہی، ساتھ میں ان کو سنتِ رسول ﷺ سے بہت شغف تھا۔ اسی شغف کا نتیجہ تھا کہ وہ تقریر بہت آہستہ آہستہ کرتے تھے، ٹھہر ٹھہر کر بولتے تھے، اطمینان سے کہ ہر آدمی ان کی پوری بات سمجھ لیتا تھا، بلکہ ہم جیسے لوگ گھبرا بھی جاتے۔ کہتے ہیں کہ جب ان کی تقریر ہوتی تھی تو ابتدا میں اگر پانچ سو آدمی ہوتے تھے تو تقریر کے ختم ہوتے ہوتے سو ہی بچتے تھے۔ یہ ان کی سب

تقریروں میں نہیں ہوتا تھا بلکہ کچھ خاص تقریروں میں تھا۔ دارالعلوم دیو بند میں بخاری شریف پڑھایا کرتے تھے، شیخ الحدیث تھے۔ ایک بزرگ عالم فرمارہے تھے کہ مولانا درس کی تقریر میں بہت اطمینان سے بولتے تھے، اور ہم لوگ چاہتے تھے کہ ذرا جلدی بولیں۔ تو ایک طالب علم نے پرچہ لکھ کر بھیج دیا کہ 'حضرت! آپ اتنا رُک رُک کر بولتے ہیں، کیا تیز بولنے پر قادر نہیں ہیں؟' حضرت نے سب کے سامنے اس پرچے کو پڑھا اور پھر فرمایا کہ 'نہیں بھائی! ایسی بات نہیں ہے۔ میں بھی تقریر تیز کرتا تھا اور اب بھی کرسکتا ہوں، لیکن جب سے میں نے حدیث میں دیکھا ہے کہ 'كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَتَكَلَّمُ بِكَلَامٍ بَيْنَه فَصْلٌ، يَحْفَظُه مَنْ جَلَسَ إِلَيْهِ۔' [ترمذی: ۳۶۳۹] آپ ﷺ بات کرتے تھے تو ہر بات جدا جدا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ جو آپ کے پاس بیٹھا ہوتا وہ اسے یاد کرلیتا۔ اتنے اطمینان سے آپ بات کرتے تھے۔ تو جب میں نے یہ دیکھا تو میں نے بھی اس کی مشق کرلی ہے کہ جیسے آپ ﷺ بولتے تھے ویسے ہی مجھے بھی بولنا ہے۔

آدمی کو کسی کی کوئی بات بھلی معلوم ہوتی ہے تو کبھی شعوری طور پر اور کبھی غیر شعوری طور پر اس کی نقل کرنے لگتا ہے، اور طبیعت کو اسی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ کیوں کہ وہ چیز اس کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ کبھی شکل وصورت میں، کبھی خطابت میں اور کبھی تحریر میں۔ ہم لوگوں نے بھی بہت سے لوگوں کی تحریریں پڑھیں، کسی کی تحریر ذہن میں کھُب گئی، دل میں جم گئی تو اب از خود ویسے ہی لکھنے لگے۔ کوئی آدمی بذاتِ خود کوئی چیز ایجاد نہیں کرتا ہے، وہ اپنے آگے والوں کو دیکھتا ہے، اسی کو نمونہ بناتا ہے، اسی کے مطابق چلتا ہے۔ اسی نمونہ میں کچھ اَور اصلاح کر کے اور بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

سب سے بہتر نمونہ اللہ کے رسول ﷺ کے اندر ہے:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انسان جو بہت سے نمونے اختیار کرتا ہے اور اسی کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالتا ہے، تو اگر تم کو اپنے آپ کو کسی نمونہ میں ڈھالنا ہی ہے اور نمونہ تم کو چاہیے ہی، تو سب سے اچھا نمونہ اور سب سے بہتر نمونہ اللہ کے رسول ﷺ کے اندر

ہے۔ یہاں ہر چیز نمونہ کی ہے، بات، وہ بھی نمونہ کی، شکل وصورت، وہ بھی نمونہ کی، طریقہ اور مزاج، وہ بھی نمونہ کا۔ ہر اعتبار سے آپ نمونۂ کامل اور نمونۂ حسن ہیں۔ اللہ نے ایمان والوں کو گھیر دیا کہ کوئی اور نمونہ تمھارے لیے نہیں ہے، بس یہی ایک نمونہ کافی ہے۔ باقی اور جتنے نمونے ہیں، اگر اِس نمونے کے مطابق ہیں تو بہت اچھے، اور جتنا اس نمونے سے فرق ہوگا اتنی ہی اس کی اچھائی میں کمی ہوگی۔

اللہ تعالیٰ سورہ لقمان میں ارشاد فرماتے ہیں: وَاتَّبِعُ سَبِيُلَ مَنُ أَنَابَ إِلَيَّ۔ [۱۵] جو شخص میری طرف انابت کرتا ہے، میری طرف اپنی توجہ مرکوز کرتا ہے، مجھے مقصود بناتا ہے، تم اس کی پیروی کرو۔ دیکھ لو کہ کس کے دل کا رخ کدھر ہے؟ کس کی توجہ کا رخ کدھر ہے؟ اگر اِدھر اُدھر کسی کی توجہ کا رخ ہے تو وہ قابلِ اتباع نہیں۔

انابت الی اللہ کا مطلب:

انابت کہتے ہیں کسی طرف جھک پڑنے کو اور عاجزی اور تواضع کے ساتھ کسی طرف جانے کو۔ تم دیکھو ایسے شخص کو جو میری طرف جھکتا ہے، وہ کوئی کام کرتا ہے تو میرے لیے کرتا ہے، وہ ہر کام سے رضائے الٰہی مقصود رکھتا ہے، وہ اپنی اولاد کے ساتھ معاملہ بھی کرتا ہے تو اس لیے نہیں کہ یہ میری اولاد ہے، بلکہ اس لیے کہ اللہ نے اولاد کے بارے میں یہی حکم دیا ہے۔ وہ کسی سے محبت کرتا ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ فلاں ہے، بلکہ اس لیے کہ اللہ نے یہی حکم دیا ہے۔

جذباتی محبت اور دوستی کی کوئی عمر نہیں ہوتی:

حضرت تھانوی بڑے بزرگ اور عالم تھے۔ ان سے ان کی اہلیہ کہنے لگیں کہ ’آپ کو ہم سے تو کوئی محبت ہے نہیں، آپ تو بس اللہ کا حکم پورا کرنے کے لیے یہ سب کرتے ہیں، ورنہ حقیقت میں آپ کو ہم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔‘ یہ بات ظاہر ہے کہ ایک شوہر کو اپنی بیوی سے اور بیوی کو اپنے شوہر سے جذباتی تعلق ہوتا ہے۔ اور اسی جذباتی تعلق میں تسکین رہتی ہے، مگر وہ کہہ رہی تھیں کہ آپ کو ہم سے کوئی جذباتی تعلق نہیں ہے۔

تو حضرت مولانا نے جواب بہت اچھا دیا۔فرمایا کہ ’ایسی بات ہے تب تو بہت ہی اچھا ہے۔اس لیے کہ اللہ کا حکم دایم ہے،تو ہمارا یہ معاملہ بھی دایم رہے گا،اس میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔تم بیوی ہو اور میں شوہر ہوں،اور اللہ نے بیوی اور شوہر کے درمیان جس تعلق کا حکم دیا ہے،وہ میں ہمیشہ باقی رکھوں گا۔کیوں کہ اللہ کا حکم ہر حال میں پورا کرنا ہی ہے۔اور جو جذباتی محبت ہوتی ہے،اس میں بہت اتار چڑھاؤ ہوتا ہے۔آج جذبات بہت ہیں تو بہت محبت ہے،کل وہ جذبات ٹھنڈے ہو گئے تو معلوم ہوا کہ ایک دوسرے سے بیزار ہو گئے،منہ پھیر لیا۔‘

مجھ سے اگر کوئی کہتا ہے کہ ’فلاں لڑکے کو یا فلاں لڑکی کو فلاں کے ساتھ عشق ہو گیا ہے،کوئی تدبیر کر دیجیے۔‘ تو میں کہتا ہوں کہ ’ان دونوں کا نکاح کر دو۔سال چھ مہینے میں سارا عشق ختم ہو جائے گا،سب جذبات ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جائیں گے۔‘ یہ جذباتی محبت کوئی چیز نہیں ہے،یہ تو آناً فاناً ختم ہو جائے گی۔ہاں وہ محبت جو اللہ کی وجہ سے ہوگی،اس میں کبھی کوئی خلل نہیں آئے گا۔اس میں خلل آنا تو دور کی بات ہے دنیا کے بعد آخرت میں بھی وہ باقی رہے گی۔اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:اَلْاَخِلَّاءُ یَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ۔ [الزخرف:٦٧] دنیا کی جتنی دوستیاں ہیں سب عارضی ہیں،یہ دنیا ہی تک ہیں،ان کا سرا آخرت تک نہیں جاتا ہے۔مگر جو صاحبِ تقوی ہیں،یعنی اللہ کی وجہ سے کسی سے محبت کرتے ہیں اور اللہ ہی کی وجہ سے تعلق رکھتے ہیں،تو یہ تعلق اور محبت قیامت کے دن بھی باقی رہے گی۔اس لیے کہ اللہ کا حکم دایمی ہے،اور اس حکم کی وجہ سے جو چیز وجود میں آئے گی وہ بھی دایمی شان کی ہوگی۔اور انسان کے جذبات تو غیر دایمی ہیں۔

دنیا میں نمونہ اور آئیڈیل صرف ایک ذات ہے:

انسان کو آئیڈیل اور نمونہ چننے سے پہلے دیکھ لینا چاہیے کہ وہ کس کو نمونہ بنا رہا ہے؟اور کس بنیاد پر بنا رہا؟اس دنیا میں سب سے بہتر نمونہ،بلکہ کہیے صرف ایک ہی نمونہ

ہے۔ اور وہ ہے رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی۔ اس لیے کہ اللہ نے ان کو اپنے لیے بنایا ہے، اور ہمیشہ ان کا رخ اللہ ہی کی طرف رہا ہے: قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ [الانعام: ۱۶۲] اللہ نے ان سے کہا کہ تم اعلان کر دو کہ میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت سب اللہ کے لیے ہے۔

سید احمد شہید کا عملی نمونہ اسوۂ نبوی کے مطابق:

حضرت سید احمد شہید حج کرنے جا رہے تھے۔ کلکتہ سے دس پانی کا جہاز انھوں نے کرایے پر لیا۔ ان دس جہازوں میں ایک جہاز بڑی شان وشوکت کا اور شاہانہ انداز کا تھا۔ اور ایک جہاز خاصا پرانا اور خستہ حالت میں تھا جو ٹھیک سے چلتا بھی نہیں تھا۔ سید صاحب کے ساتھ سات سو آدمیوں کا قافلہ تھا۔ ہندستان سے اُس زمانہ میں پہلی مرتبہ کوئی اتنا بڑا قافلہ لے کر حج کے لیے جا رہا تھا، ورنہ یہاں کے لوگوں نے تو فتوی دے رکھا تھا کہ ہندستانیوں پر حج فرض نہیں ہے۔ سمندر کا سفر کرنا پڑتا ہے، خطرات ہیں، امنِ راہ حاصل نہیں ہے، اس لیے حج فرض نہیں ہے۔ اِکا دُکا لوگ حج کے لیے جاتے تھے، عام طور سے حج کرنے کا رواج نہیں تھا۔ سید صاحب نے اعلان کیا کہ 'ہم حج کرنے جائیں گے اور جس کا جی چاہے ہمارے ساتھ چلے۔ جو خرچ ہو ساتھ لے لے، ورنہ خالی ہاتھ ہمارے ساتھ ہو جائے۔ جہاں خرچ کی کمی ہوگی وہیں رک جائیں گے اور محنت ومزدوری کر کے پیسہ حاصل کریں گے، پھر آگے بڑھیں گے، چاہے جتنے دن حج میں لگ جائیں۔' پھر انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ 'اللہ کی ذات سے امید ہے کہ بڑے آرام سے جائیں گے اور بڑے آرام سے آئیں گے۔' خیر وہ رائے بریلی سے کلکتہ تشریف لے گئے۔ کلکتہ پہنچنے میں مہینوں لگے۔ کلکتہ سے عرب تک کے لیے دس جہاز کرایے پر لیے اور جو سب سے گھٹیا جہاز تھا، اس کو اپنے لیے منتخب کیا۔ جہاز راں جو ملک التجار تھا، اس نے کہا کہ 'حضرت! آپ فلاں جہاز میں بیٹھیے، وہ شاہانہ جہاز ہے، اُس سے جائیں گے تو آپ کی شان و شوکت رہے گی۔ اور اس ٹوٹے جہاز سے جائیں گے تو کوئی آپ کو جانے گا بھی نہیں۔'

فرمایا ’میاں! تم دنیا کی شان وشوکت سمجھتے ہو، میں تو دنیا کی شان وشوکت کو سڑے ہوئے مردار سے بھی زیادہ خراب سمجھتا ہوں۔ عزت تو وہ ہے جو اللہ دیں گے۔‘ اُس شاہانہ شان وشوکت والے جہاز سے نہیں گئے، بلکہ اسی خراب جہاز پر سوار ہوئے۔ لوگ کہنے لگے کہ ’کہیں راستہ ہی میں نہ رہ جائیں؟‘ فرمایا ’ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں، ان شاء اللہ آرام سے اور جلدی پہنچ جائیں گے۔‘ اور ہوا بھی وہی کہ بہت آرام سے اور بہت جلد پہنچ گئے۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اسوہ ہے:

میں یہ کہہ رہا ہوں جناب نبی کریم ﷺ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ، آپ کی زبان کا ایک ایک بول، آپ کا ایک ایک قدم، کوئی بھی دنیا میں ایسا نہیں دکھا سکتا ہے جو مرضیِ الٰہی کے علاوہ ہوا ہو۔ آدمی بات کرنے میں سب سے زیادہ آزاد رہتا ہے۔ کام کرتا ہے تو ذرا سوچ سمجھ کر کرتا ہے، مگر بات کرنے میں ہر طرح کی بات زبان پر آتی رہتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ بھی بات کرتے تھے۔ ایک صحابی ہیں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص، وہ پڑھے لکھے تھے۔ ان کو شوق ہوا کہ جو بھی حضور ﷺ فرماتے ہیں، میں اس کو لکھ لیا کروں، تو انھوں نے لکھنا شروع کیا۔ بعد میں کچھ لوگوں نے ان سے پوچھا کہ ’تم حضور ﷺ کی سب باتیں لکھ لیتے ہو؟‘ انھوں کہا کہ ’جی ہاں، جو سنتا ہوں سب لکھ لیتا ہوں۔‘ کہا ’ارے بھائی! آپ کبھی غصہ میں ہوتے ہیں اور کبھی رنج میں ہوتے ہیں، ہر بات لکھنے کی نہیں ہوتی۔‘ انھوں نے کہا ’ٹھیک ہے، میں حضور ﷺ سے پوچھ لیتا ہوں۔‘ جب انھوں نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ ’حضرت! میں آپ کی سب باتیں لکھ لیتا ہوں، مگر کچھ لوگ ایسا ایسا کہہ رہے ہیں۔‘ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ’اُكْتُبْ فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ ،مَا يَخْرُجُ مِنْهُ اِلَّا حَقٌّ۔ [ابوداؤد:۳۶۴۶] تم سب لکھ لو۔‘ اور اپنی زبان کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ ’قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اس زبان سے حق بات کے علاوہ کوئی بات نکلتی ہی نہیں۔‘ اور اللہ نے بھی اس کی گواہی دی ہے: مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى۔ [النجم:۳-۴] اپنی خواہش سے، اپنی طبیعت سے کوئی بات

نہیں کہتے۔ جو کچھ کہتے ہیں اللہ کی طرف سے اشارہ ہوتا ہے، اس کی طرف سے وحی ہوتی ہے، تب کہتے ہیں۔

وحی دو طرح کی ہوتی ہے:

وحی دو طرح کی ہے: ایک وہ ہے جو الفاظ کے ساتھ آتی ہے، اور اس کا پڑھنا اور اس کی تلاوت کرنا عبادت ہے۔ یہ قرآن شریف کی صورت میں ہے۔ اور ایک وحی غیر متلو ہے، جس کی تلاوت نہیں ہوتی۔ لیکن ہے دونوں وحی۔ دونوں اللہ کے اشارہ ہی پر بات ہوتی ہے، کوئی بات اپنی مرضی سے کہتے ہی نہیں۔ اس لیے گناہ کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ اگر ان سے کوئی گناہ ہو جائے تو وہ بھی نمونہ بن جائے گا۔ اور لوگ اس کو بھی نمونہ سمجھ کر کرنے لگیں گے۔

اگر آدمی کو اچھائی چاہیے تو رسول اللہ ﷺ کے طریقہ پر چلے:

رسول اللہ ﷺ نمونۂ کامل ہیں، سب سے بہتر نمونہ ہیں۔ اگر آدمی کو اچھائی چاہیے تو انھیں کے طریقہ پر چلے۔ جتنا ان کے طریقے پر ہوگا، اتنا ہی حسین، اتنا ہی خوب صورت، اتنا ہی بہتر، سیرت کے اعتبار سے اور صورت کے اعتبار سے ہوتا چلا جائے گا۔ اور جو اُن سے دور ہوا، اور جتنا دور ہوا سیرت وصورت کے اعتبار سے، اس میں اُتنی ہی کمی آتی چلی جائے گی۔

یہاں فرمایا: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَة۔ تمھارے لیے رسول اللہ ﷺ میں عمدہ نمونہ ہے۔ اس نمونہ میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس پر انگلی رکھی جاسکے کہ یہ ذرا دبا ہوا کام ہے۔ سب اعلی درجہ کا ہے۔ جو کچھ بھی آپ کی زندگی میں ہے، سب اعلی درجہ کا ہے۔

یہ نمونہ کس کے لیے ہے؟ اس نمونہ کو کون اختیار کرے گا؟ فرماتے ہیں: لِمَنْ كَانَ يَرْجُوْ اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ۔ وہ آدمی جو اللہ سے ملاقات کی امید رکھتا ہے اور یوم آخرت کو دیکھنے کی امید رکھتا ہے۔ اسے یہ یقین ہے کہ مجھے اللہ کے حضور قیامت کے دن

حاضر ہونا ہے، تب وہ ان کے نمونے کو اختیار کرے گا۔ جس کو اس کی پرواہ ہی نہ ہو، وہ کاہے کو اس نمونہ کو اختیار کرے گا؟

وَذَكَرَاللّٰهَ كَثِيْراً۔ اور اللہ کو بہت سا یاد کرتا ہے۔ جب خدا کی طرف متوجہ ہوگا تب اس نمونہ پر عمل کرے گا۔ جس کو اللہ سے ملنے کی امید ہے، یقین ہے، جس کو قیامت کے دن ملاقات کا یقین ہے اور جو اللہ کا بہت ذکر کرتا ہے، اس کے لیے رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی نمونہ ہے۔

اس وقت جہاں یہ کلام آرہا ہے روے سخن درحقیقت منافقین کی طرف ہے، جو اپنے آپ کو مومن کہتے تھے۔ اگر مومن تھے تو ان کے لیے زیبا نہیں تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو کسی حال میں چھوڑ کر جاتے۔ اور اہل ایمان کو بتایا گیا کہ منافقین جو کررہے ہیں، وہ تمھارا عمل نہیں ہونا چاہیے، بلکہ آپ کے حقیقی ساتھیوں نے جو طرزِ عمل اختیار کیا، وہ ہونا چاہیے۔ یعنی صحابہ کرام نے ایک لحظہ کے لیے آپ کو...... چاہے حالتِ جنگ ہو یا حالتِ امن...... نہیں چھوڑا۔

غزوۂ احزاب جیسے نازک حالات میں 'اے لوگو! رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں نے جس ثابت قدمی کا ثبوت دیا ہے، ویسے ہی تم لوگوں کو بھی رہنا ہے۔' یہ لوگوں کے لیے ایک بہترین درسِ عمل اور عمدہ اسوہ و نمونہ ہے۔

پھر اہل ایمان کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: وَلَمَّا رَاَى الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْاهٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِيْمَانًا وَتَسْلِيْمًا۔ اور جب ایمان والوں نے اس فوج کو دیکھا۔ یعنی کفار کی مشترکہ فوج کو تو انھوں نے کہا کہ یہ وہی ہے جس کا ہم سے اللہ اور اس کے رسول نے وعدہ کیا ہے۔ اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا۔ اور ان کا ایمان اور یقین اَور بڑھ گیا۔ منافقین کا تو یہ حال تھا کہ وہ کہہ رہے تھے کہ: مَاوَعَدَنَااللّٰهُ وَرَسُوْلُه اِلَّا غُرُوْراً۔ اللہ اور اس کے رسول نے تو صرف ہم سے دھوکے کا وعدہ کیا ہے۔

خندق کھودتے وقت کی صورت حال:

خندق کھودتے وقت صورت حال ہی ایسی تھی۔ سچے مومنین کو ان کے ایمان ہی نے سنبھال کر رکھا تھا، ورنہ منافقین تو تَظُنُّونَ بِاللّٰهِ الظُّنُونَا۔ طرح طرح کی الٹی پلٹی بات شروع کر دی تھی۔ کھدائی کے دوران ایک بڑی سی چٹان پڑ گئی جو کسی سے نہیں ٹوٹ رہی تھی۔ لوگ تھک گئے تو بالآخر رسول اللہ ﷺ سے آ کر عرض کیا۔ آپ تشریف لے گئے اور جس ہتھوڑے سے توڑا جا رہا تھا، اسے اپنے ہاتھ میں لیا اور ایک ضرب لگائی جس سے ایک روشنی پیدا ہوئی اور وہ چٹان ایک تہائی ٹوٹ گئی، اور آپ نے فرمایا کہ 'مجھے روم کے محل دکھائی دے رہے ہیں، اللہ نے وہ مجھے دیا۔' دوسری ضرب لگائی تو پھر ایک روشنی ہوئی اور مزید ایک تہائی چٹان ٹوٹ گئی، اور آپ نے فرمایا کہ 'مجھے مصر کے محل دکھائی دے رہے ہیں۔' یہ سن کر منافقین ہنستے تھے کہ پیٹ میں ڈالنے کے لیے کھانا نہیں ہے، اور بات اتنی بڑی بڑی ہے۔ مگر اہل ایمان کہتے تھے: صَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُه۔ اللہ اور اس کے رسول سچ کہتے ہیں، چاہے ابھی فقر و فاقہ ہے۔ اس وقت یہی حال تھا کہ سب لوگ بھوکے تھے۔

حضرت جابر کی دعوت اور کھانے میں برکت:

حضرت جابر نے حضور ﷺ کے پیٹ پر دو پتھر بندھے ہوئے دیکھے تو دوڑے ہوئے اپنے گھر گئے اور بیوی سے پوچھا کہ 'کچھ کھانے کو ہے؟ حضور ﷺ کو دیکھ کر آ رہا ہوں کہ آپ کے پیٹ پر پتھر بندھے ہوئے ہیں۔ یہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔' بیوی نے کہا کہ 'تھوڑا سا آٹا ہے، اور ایک بکری کا بچہ ہے۔ اسے ذبح کر کے سالن بنا لیتے ہیں، اور آٹے کی روٹی بنا لیتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے کھانے کے لیے ہو جائے گا۔' فوراً انھوں نے بکری کو ذبح کیا اور ان کی بیوی کھانا بنانے لگ گئیں۔ حضرت جابر واپس حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور آہستہ سے عرض کیا کہ 'حضرت! میرے گھر تھوڑا سا کھانا ہے، آپ تشریف لے چلیں اور کھانا کھالیں، ایک دو آدمیوں کو اور اپنے ساتھ لے لیں۔' آپ نے پوچھا کہ 'کیا ہے؟' تو عرض کیا کہ 'تھوڑا سا آٹا تھا، اس کی روٹی، اور ایک بکری بچہ تھا،

اسے ذبح کر کے آرہا ہوں۔' آپ نے فرمایا کہ 'بہت اچھا۔' اس کے بعد آپ نے اعلان فرمادیا کہ 'لوگو! چلو، آج جابر کے گھر دعوت ہے، وہاں چل کر کھانا کھایا جائے۔' ہزار کے قریب افراد تھے، قریب چودہ سو لوگ تھے۔ حضرت جابر گھبرا گئے کہ تھوڑا سا کھانا ہے، اتنے لوگ جائیں گے تو ایک آدمی کے حصے میں کتنا کھانا آئے گا؟ مگر آپ ﷺ اعلان کر چکے تھے۔ حضرت جابر گھبرائے ہوئے گھر پہنچے اور بیوی سے کہا کہ 'غضب ہو گیا، حضور ﷺ سب کو لے کر آرہے ہیں۔' ان کی بیوی بہت سنجیدہ اور زیرک خاتون تھیں۔ انھوں نے پوچھا کہ 'سب کو آپ نے تو نہیں کہا ہے نا؟ حضور ﷺ نے کہا ہے تو اب وہی سب کو کھلانے کے ذمہ دار ہیں۔ آپ چپ چاپ دیکھتے رہیے۔' حضور ﷺ سب کے ساتھ تشریف لائے، پوچھا 'آٹا تیار ہے؟' معلوم ہوا کہ گوندھ کر رکھا ہے، صرف پکانا باقی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ 'بہت سے چولھے بناؤ اور جتنی روٹی پکانے والی عورتیں ہیں سب کو بلاؤ۔' تھوڑا سا آٹا تھا اور حکم ہو رہا ہے کہ سب پکانے والیوں کو بلالو، یہ کیا تھا؟ یہ ایمان کی طاقت تھی، اللہ پر بے پناہ بھروسہ تھا۔ چنانچہ چولھے بنائے گئے اور عورتیں آگئیں۔ پھر آپ نے اس میں اپنا تھوڑا سا لعاب دہن ڈال دیا اور کچھ پڑھ دیا اور فرمایا کہ 'اب اس کو پکانا شروع کردو۔' ہر چولھے پر آٹا پہنچا دیا گیا اور روٹی پکنے لگی۔ گوشت پک چکا تھا، اس کے بارے میں فرمایا کہ 'میرے پاس لاؤ۔' لایا گیا تو اس میں بھی آپ نے کچھ پڑھ دیا اور فرمایا کہ 'اس کو کھولو مت، اسی طرح اس میں سے نکالتے رہو۔' روٹی آتی رہی، سالن نکالے جاتے رہے، دس دس، بیس بیس آدمی کی ٹولی بیٹھ کر کھاتی رہی، کھانے کا سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ سب لوگ آسودہ ہو کر کھالیے، اور اخیر میں جناب نبی کریم ﷺ نے کھایا۔ کھانے کے بعد فرمایا کہ 'دیکھو کھانا بچا ہے یا نہیں؟' معلوم ہوا کہ ابھی بہت ہے۔ [بخاری: ۴۱۰۲]

ایک بکری کا بچہ، تھوڑا سا آٹا، اور اس کو ہزار کے قریب لوگوں نے کھایا، پھر بھی بچ گیا۔ اب اس کے بعد بھی یقین نہ آئے تو کب آوے؟ یہ تو اللہ کی بالکل کھلی نشانی ہے۔

سید احمد شہید فرماتے ہیں کہ ’بھائی! کھانا پیٹ نہیں بھرتا، پیٹ کو اللہ کا حکم بھرتا ہے۔‘ حکم ہو جائے گا تو بھر جائے گا اور اگر حکم نہیں ہوا تو کھاتے رہو نہیں بھرے گا۔ یہ تو کھلی آنکھوں مشاہدہ تھا۔ اہل ایمان کا اس سے ایمان تازہ ہو جاتا تھا۔ اور نہ جانے کتنے ایسے واقعات ہیں۔

دودھ میں برکت:

حضرت ابو ہریرہ کا واقعہ مشہور ہے۔ ایک دن وہ بھوکے تھے، کہیں سے ایک پیالہ دودھ آ گیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ’صفہ میں جتنے لوگ ہیں سب کو یہ دودھ پلاؤ۔‘ اس وقت صفہ میں ستر آدمی تھے۔ حضرت ابو ہریرہ گھبرائے کہ بھوک تو مجھے لگی ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ سب کو پلاؤ۔ سب لوگ بلائے گئے۔ حضرت ابو ہریرہ کو حکم ہوا کہ ’پلانا شروع کرو‘ وہ کہتے ہیں کہ ’میں سوچنے لگا کہ مجھے ہی پلانا ہے تو میرا نمبر سب سے اخیر میں آئے گا تو اس میں بچے گا کیا؟‘ انھوں نے تعمیل حکم میں پلانا شروع کر دیا۔ ایک پی لیتا، پیٹ بھر جاتا تو دوسرا پیتا، پھر تیسرا۔ اسی طرح ستر آدمیوں نے پی لیا۔ اس کے بعد حضرت ابو ہریرہ کو حکم ہوا کہ ’اب تم پیو۔‘ کہتے ہیں کہ میں نے منھ لگا لیا اور پینا شروع کر دیا، جب پیٹ بھر گیا تو میں نے کہا کہ ’حضرت! آپ پی لیجیے۔‘ فرمایا کہ ’نہیں تھوڑا سا اور پیو۔‘ اور پی لیا، پھر حکم ہوا کہ ’اور پیو۔‘ عرض کیا کہ ’اب بس۔‘ اس کے بعد پھر آپ ﷺ نے پیا تب جا کر دودھ ختم ہوا۔ [بخاری:۶۴۵۲]

یہ وہ چیزیں ہیں جن کو دیکھ کر اہل ایمان کا ایمان بڑھ جاتا ہے۔

کھجور میں برکت:

یہی حضرت جابر جن کا قصہ اوپر بیان ہوا، ان کے والد تھے حضرت عبداللہ، جو غزوۂ احد میں شہید ہوئے تھے۔ شہادت کے وقت ان پر قرض بہت تھا، ان کے بعد سارا قرض حضرت جابر پر آ گیا۔ اس وقت حضرت جابر بالکل نوجوان تھے۔ اور قرضہ دینے والے یہودی سود خور تھے۔ یہودیوں نے تقاضا شروع کر دیا کہ ’تمھارے باپ تو مر گئے

ہیں، اب لاؤ ہمارا قرض واپس کرو۔' یہ پریشان ہوئے۔ ایک باغ تھا، اسی کا سہارا تھا۔ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ 'مقروض بہت ہوں، اور قرض ادا کرنے کی استطاعت نہیں ہے۔ آپ یہودیوں کے یہاں سفارش کردیجیے۔' آپ ﷺ نے سفارش کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ آپ نے فرمایا کہ 'ہم تمھارے باغ میں آتے ہیں۔' حضرت ابوبکر صدیق کو لے کر آپ ﷺ ان کے باغ میں تشریف لے گئے اور باغ کے بیشتر درختوں کے پاس تھوڑی تھوڑی دیر کھڑے ہوئے۔ پھر جب وہاں سے چلنے لگے تو حضرت ابوبکر صدیق نے حضرت جابر سے کہا کہ 'سنو میاں! اب مت گھبراؤ، اب دیکھنا کہ کیا ہوتا ہے؟' پھر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ 'جب پھل توڑے جائیں تو ہر قسم کی کھجور کو الگ الگ ٹوکرے میں ڈھک کر رکھ دینا اور پھر ہم کو بتانا۔' جب کھجور توڑی گئی تو قرض خواہ آ گئے کہ 'ہمارا قرض ادا کرو۔' حضرت جابر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ 'کھجوریں تیار ہیں، اور آپ کی ہدایت کے مطابق ہر قسم کی کھجور الگ الگ کپڑے میں ڈھنک کر رکھ دیا ہے۔' چنانچہ آپ باغ میں تشریف لے گئے اور جو سب سے چھوٹی ڈھیری تھی، اس کے پاس بیٹھ گئے اور فرمایا کہ 'قرض خواہوں کو اس میں سے دو۔' چنانچہ اس میں سے کھجوریں نکال کر دی جانے لگیں، یہاں تک کہ سارے قرض خواہ اپنا قرض لے کر چلے گئے۔ جب سب چلے گئے تو حضور ﷺ فرمایا کہ 'لو بھائی! اب یہ سب تمھاری ہے۔' حضرت جابر کہتے ہیں کہ 'جب میں نے کپڑا اٹھا کر دیکھا تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کھجور پہلے زیادہ تھی یا اب بانٹنے کے بعد زیادہ ہوگئی ہے؟' [بخاری: ۲۷۸۱-۲۷۰۹]

حضور ﷺ کے واسطے سے صحابہ کرام یہ چیزیں دیکھتے تھے، اور آج ہم نقلِ صحیح سے ان سب باتوں کو جانتے ہیں۔ اس کی روایت میں کوئی کلام نہیں ہے، جیسے ان لوگوں نے دیکھا تھا اور سچ جانا تھا، ویسے ہی آج ہم سن رہے ہیں تو ہم کو بھی سچ جاننا چاہیے۔ اللہ کے نام میں، اللہ کے ذکر میں بڑی برکت ہے۔ اور یہ برکت اٹھائی نہیں گئی ہے، ابھی تک

ہے۔ جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے سچے متبع ہوتے ہیں، ان کے ساتھ ابھی بھی یہ برکت موجود ہے۔ کم سے کم کھانا ہوتا ہے، اور زیادہ سے زیادہ لوگ کھاتے ہیں۔

مولانا وصی اللہ فتح پوری صاحب کا واقعہ:

ہمارے حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کے بارے میں مفتی نظام الدین صاحب جو دارالعلوم دیوبند کے مفتیِ اعظم تھے۔ مجھ سے خود بیان کررہے تھے کہ ایک مرتبہ والدہ نے کہا کہ 'جا کر مولانا کو دعوت دے آؤ۔' میں نے جا کر کہہ دیا کہ 'حضرت اماں نے دعوت دی ہے، تشریف لے چلیں۔' فرمایا کہ 'ٹھیک ہے۔' میں نے پوچھا کہ 'کتنے آدمی رہیں گے؟' فرمایا کہ 'چار پانچ جو موجود ہیں یہاں، یہی لوگ رہیں گے۔' واپس جا کر میں نے والدہ سے کہہ دیا کہ چار پانچ آدمی کا کھانا بنادیں۔ مولانا فتح پور سے پیدل جب میرے گھر کے لیے نکلے تو راستہ میں لوگ ملتے گئے اور ساتھ ہوگئے۔ حضرت نے بھی کسی کو منع نہیں کیا۔ جب پہنچے تو اٹھارہ [۱۸] لوگ ہو چکے تھے۔ میں گھبرایا والدہ کے پاس پہنچا اور بتایا کہ 'حضرت کے ساتھ اٹھارہ لوگ آئے ہیں، اور کھانا صرف چار پانچ لوگوں کا پکا ہے۔' حضرت نے میری گھبراہٹ کو محسوس کرلیا اور فرمایا کہ 'گھبراؤ مت، والدہ سے کہہ دو کہ کچھ اور نہ پکائیں، جس برتن میں کھانا پکا ہے وہی ہمارے پاس بھیج دیں۔' چنانچہ سارے برتن آگئے اور مولانا نے فرمایا کہ 'سب لوگ خود سے نکالو اور کھاؤ۔' چنانچہ سب لوگ نکال نکال کر کھانے لگے، یہاں تک کہ سب لوگ آسودہ ہوگئے، اور کھانا بھی بچ گیا جس کو گھر والوں نے بھی کھایا۔ کھانے کے بعد مولانا صحن میں گئے جس میں ایک بڑا سا آم کا درخت تھا۔ اسی درخت کے نیچے ٹہلنے لگے۔ مفتی صاحب کہتے ہیں کہ 'میری والدہ نے مجھ سے کہا کہ 'جاؤ! حضرت سے کہو کہ یہ درخت پھلتا نہیں۔ پہلے بہت پھلتا تھا، اب ادھر تین چار سال بالکل نہیں پھلتا۔' مفتی صاحب نے جا کر کہا تو حضرت ٹہلتے ٹہلتے درخت کی ایک ٹہنی جو نیچے تھی، اس کو ہاتھ سے پکڑا اور کہا کہ 'اے! تیری شکایت ہورہی ہے کہ تو پھلتا نہیں ہے۔ پہلے پھلا کرتا تھا، اب کیوں نہیں پھلتا؟ کیا بات

ہے؟' حضرت یہ کہہ کراور دعا کر کے چلے گئے۔اور جب موسم آیا ہےتو وہ درخت اتنا پھلا کہ پورے موسم ہم آم بانٹتے بانٹتے تھک گئے۔تمام رشتہ داریوں میں جہاں جہاں ممکن ہوا، آم بانٹا مگر آم تھا کہ ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔

یہ برکت دراصل رسول اللہ ﷺ کی ہے، انھیں کے توسط سے امتیوں کو ملی ہے۔ جوان کے اسوہ پر چلے گا، اسے یہ برکت حاصل ہوگی۔ جو جتنا اس نمونہ پر چلے گا، اسے اتنا ہی کمال حاصل ہوتا چلا جائے گا۔ یہ کمال جو حاصل ہوگا وہ رہے گا درحقیقت انھیں کا، انھیں کے طفیل میں ہوگا۔جیسے سورج چمکتا ہے تو روشنی اس سورج کی ہوتی ہے، مگر در و دیوار سب روشن ہوجاتے ہیں۔ یہ در و دیوار کی روشنی نہیں ہے، یہ سورج کی ہی روشنی ہے جو ان کو روشن کیے ہوئے ہے۔اسی طرح اللہ والوں کے یہاں جو برکتیں دکھائی دیتیں ہیں یہ ان کی اپنی نہیں ہے، یہ وہیں سے آئی ہوئی ہے۔

آگے فرماتے ہیں: مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَیْهِ مومنین میں سے کتنے ایسے ہیں جنھوں نے سچ کر دکھایا جو انھوں نے اللہ سے وعدہ کیا۔ بعض لوگوں نے اللہ سے عہد کیا تھا۔اس کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ اسلام کی پہلی جنگ بدر میں اچانک مقابلہ ہوگیا تھا۔آپ ﷺ تین سو تیرہ آدمیوں کو لے کر نکلے تھے کفار کے ایک قافلہ کو روکنے کے لیے۔ جب آپ نکلے تو یہ خبر مکہ پہنچ گئی اور وہاں سے ایک ہزار کا لشکر چڑھ آیا لڑنے کے لیے۔ چنانچہ مقابلہ ہوا اور اللہ نے بے نظیر کامیابی عطا فرمائی۔ جنگ بدر کی بڑی بڑی فضیلتیں وارد ہوئی ہیں۔ یہاں تک فضیلت آئی کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ 'اے اہل بدر! اللہ نے فرمایا ہے کہ 'إِطَّلَعَ عَلَی اَهْلِ بَدْرٍ' اللہ نے اہل بدر کو دیکھا اور فرمایا کہ 'إِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ۔[السلسلة الصحیحة: ۳۴۰۵] جو چاہو تم لوگ کرو، تمھاری بخشش ہوچکی ہے۔یعنی پہلے معرکہ میں تم لوگوں نے اتنا بڑا کام کیا ہے، اس لیے اب تمھارے سارے گناہ معاف۔ چوں کہ اہلِ اسلام باقاعدہ جنگ کے لیے نکلے نہیں تھے، بلکہ اچانک جنگ کا سامنا ہوگیا تھا، اس لیے مسلمانوں میں سے بہت سے

لوگ ایسے تھے جو اس میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔اب ان کو قلق ہوا کہ اتنا اچھا موقع نکل گیا، تو ان میں بعض لوگوں نے اللہ کے حضور عرض کیا کہ ’یہ موقع تو چوک گیا، لیکن اے اللہ! اگر آئندہ کوئی موقع ہاتھ آیا تو اس کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا جائے گا۔‘ چنانچہ اس کے ایک سال کے بعد غزوۂ احد کا معاملہ پیش آیا اور یہ اس سے زیادہ سنگین تھا۔ چنانچہ جن لوگوں نے وعدہ کیا تھا وہ میدان میں آ گئے اور ایسا آئے کہ حضرت انس بن نضر ایک صحابی ہیں، یہ اس وقت جب کہ دورانِ جنگ مسلمانوں میں انتشار پھیل گیا تھا اور شکست کی صورت ہوگئی تھی، بھاگے ہوئے آئے اور دیکھا کہ مسلمان اِدھر اُدھر منتشر ہو رہے ہیں، تو آواز لگائی کہ ’تم لوگ اِدھر اُدھر کہاں جا رہے ہو؟ جنت کی نعمتیں اِدھر تمھارا انتظار کر رہی ہیں۔‘ یہ کہہ کر میدان میں اتر گئے اور اس بے جگری سے لڑے کہ شہید ہو گئے۔ ان کے جسم پر اتنا زخم لگا تھا کہ شکل پہچانی نہیں جاتی تھی۔ان کی انگلیاں دیکھ کر ان کی بہن نے شناخت کی۔[بخاری:۲۸۰۵] اسی کی تعریف کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا کہ ’کچھ لوگوں نے اللہ سے عہد کیا تھا اور اپنا عہد پورا کر دیا اور اپنی جان اللہ کے راستے میں قربان کر دی۔‘

فَمِنۡهُم مَنۡ قَضَى نَحۡبَهُ وَمِنۡهُم مَنۡ يَنۡتَظِرُ ۔ ان میں سے بعض نے تو اپنی بات پوری کر دی، یعنی وہ اللہ کے راستے میں شہید ہو گئے، اور ان میں سے بعض ابھی راستہ دیکھ رہے ہیں، انتظار کر رہے ہیں۔ وہ بھی اپنے عہد سے ہٹے نہیں ہیں۔ان میں سے کتنے حضور ﷺ کے زمانے میں اور کتنے آپ ﷺ کے بعد ہونے والے جہاد میں شہید ہوئے۔

یرموک کی جنگ میں ابوجہل کے صاحبزادے عکرمہ جو بہت مشکل سے ایمان لائے تھے، مگر جب ایمان قبول کر لیا تو بہت پکے ہو گئے۔ میدان جنگ میں اعلان کیا کہ مجھ کو چار سو آدمی چاہئیں جو اپنی جان کو جان نہ سمجھیں۔ مسلمانوں کا کل لشکر ۲۳/ ہزار تھا اور کفار کا لشکر تین لاکھ تھا۔ چار سو آدمی کو منتخب کر کے وہ جنگ میں کود ے ہیں تو سب لوگ شہید ہو گئے مگر لڑائی کا رخ بدل دیا۔ کفار کو زبردست شکست ہوئی۔تو اللہ نے ان کی

تعریف کی کہ کچھ لوگوں نے حضور ﷺ کے زمانے میں اپنا عہد پورا کردیا اور کچھ لوگ انتظار میں ہیں کہ جب وقت آئے گا تو وہ بھی اپنا وعدہ پورا کریں گے۔ یہ منافقین کے مقابلہ میں اہل ایمان کی اللہ تعالی تعریف کررہے ہیں۔

اور فرمایا وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۔ اور کوئی تبدیلی نہیں کی۔ یعنی ذرا بدلے نہیں۔ وہی جذبہ وہی لگن اور وہی پختہ ارادہ ہے۔

پھر فرماتے ہیں: لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصَّادِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنَافِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ۔ تاکہ بدلہ دے اللہ سچوں کو ان کی سچائی کا اور عذاب دے منافقوں کو اگر چاہے۔ یعنی منافقین نے عذاب کا کام تو کیا ہے، اگر اللہ چاہے تو ان کو عذاب دے، اور اگر چاہے تو ان پر مہربانی کرے اور ان کو توبہ کی توفیق عطا فرمادے۔ چنانچہ ایسے بھی منافقین ہوئے ہیں جن کو بعد میں توبہ کی توفیق ہوگئی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَحِيْمًا ۔ اللہ تعالی مغفرت فرمانے والے رحم کرنے والے ہیں۔

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا۔ اور اللہ نے واپس کردیا کافروں کو ان کے غصہ کے ساتھ۔ بڑے غصے میں آئے تھے اور جیسے آئے تھے، ویسے ہی واپس کردیے گئے۔ ایمان والوں کا کچھ بگاڑ نہیں سکے۔ مدینہ کی ایک انچ زمین پر قبضہ نہیں کرسکے۔ کسی کو ایمان سے پھیر نہیں سکے۔ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۔ کوئی بھلائی ان کے ہاتھ نہیں لگی۔ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۔ اللہ تعالی نے مومنین کی لڑائی اپنے ذمہ لے لی اور اللہ ہی کافی ہوگیا۔ لڑائی سرے سے ہوئی ہی نہیں، مومنین خندق کے ایک طرف اور کفار دوسری طرف۔ صرف ایک دو ہلکی پھلکی جھڑپ ہوئی تھی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قوت:

ایک آدمی اُدھر سے خندق کود کر آیا تھا، بہت بھاری اور بہادر تھا، ہزار آدمی کے لیے اکیلا کافی سمجھا جاتا تھا۔ حضور ﷺ نے حضرت علی کو بھیج دیا اس سے مقابلہ کے لیے۔

حضرت علی پستہ قد تھے، اس نے دیکھ کر کہا کہ ’ارے بابا! تم اپنی جان پر رحم کرو، کہاں آ گئے مجھ سے لڑنے کے لیے؟‘ حضرت علی کہا ’نہیں، میں آ گیا ہوں، آپ آیئے تو سہی۔‘ تھوڑی دیر پینترا بازی ہوتی رہی، اس کے بعد اس کو ختم کر کے اس کی لاش گڑھے میں ڈال دی۔ پھر اس کے بعد کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ جھڑپ کے لیے بھی آتا۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی بہادری:

ایک قصہ اور ہوا۔ یہ لشکر تو مدینہ کے باہر تھا۔ مدینہ میں یہود جو بنی قریظہ کے تھے، انھوں نے غداری کی اور مسلمانوں سے جو معاہدہ ہوا تھا، اسے توڑ کر کفار سے مل گئے اور سازشیں کرنے لگے۔ حضور ﷺ نے مسلمان عورتوں کو ان غداروں سے بچانے کے لیے ایک قلعہ نما عمارت میں رکھ کر اس پر پہرا لگا دیا تھا۔ قریظہ کا ایک آدمی ماحول دیکھنے کے لیے آیا کہ اگر ہم لوگ اندر سے عورتوں پر حملہ کریں تو اس کی مسلمانوں نے کیا تیاری کی ہے؟ اس وقت پہریداری کے لیے حضرت حسان بن ثابت متعین تھے، وہ بیمار تھے، ان کے گھٹنے میں تکلیف تھی۔ ان سے حضرت صفیہ حضور ﷺ کی پھوپھی نے کہا کہ ’یہ آدمی ٹہل یہاں رہا ہے، خطرناک معلوم ہوتا ہے۔‘ حضرت حسان نے کہا ’چھوڑو جانے دو، کوئی ہوگا۔‘ انھوں نے کہا کہ ’نہیں اس کو دیکھنا ہے۔‘ لکڑی کا ایک کھونٹا لیا اور اس کی طرف آہستہ سے بڑھیں اور اس کے پیچھے جا کر اس کے گھٹنے پر ایسا وار کیا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا، اور پھر دو چار اور لگا کر اس کا کام تمام کر دیا۔ پھر خواتین نے اس کی لاش اٹھا کر ٹھکانے لگا دی۔ قریظہ کو جب معلوم ہوا تو کہا کہ ’یہاں بھی لشکر معلوم ہوتا ہے، ہمارا آدمی گیا تو اس کو مار ڈالا۔‘ پھر کسی کو آنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

مگر ان لوگوں نے بڑی غداری کی تھی، اس سے حضور ﷺ کو سخت تکلیف پہنچی تھی۔ جب غزوۂ خندق سے فارغ ہو کر آپ گھر آ گئے اور ہتھیار اتارنے کے لیے اندر گئے اور پھر اسی طرح ہتھیار بند باہر آ گئے، اور صحابہ کرام سے فرمایا کہ کوئی ہتھیار نہ اتارے، میں ابھی ہتھیار اتارنے کے لیے اندر گیا تھا تو جبریل آ گئے اور انھوں نے کہا کہ

’ابھی ہتھیار مت اتاریے، پہلے قریظہ کا کام تمام کر لیجیے۔‘ قریظہ کی آبادی مدینہ سے دور پورب کی طرف تھی۔ یہ ظہر کے بعد کا وقت تھا۔آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ’ جلدی کرو، عصر کی نماز قریظہ میں پڑھی جائے گی۔‘ صحابہ نکلے تو عصر کا وقت راستہ ہی میں ہو گیا تو کچھ لوگوں نے کہا کہ عصر پڑھ لی جائے اور کچھ لوگوں نے کہا کہ نہ پڑھی جائے۔ حضور ﷺ نے قریظہ میں عصر پڑھنے کے لیے کہا ہے۔قریظہ تک جاتے جاتے مغرب کا وقت ہو گیا، عصر کی نماز قضا ہو گئی۔ کچھ لوگوں نے راستہ میں ہی پڑھ لیا تھا اور کچھ لوگوں نے کہا تھا کہ وہیں جا کر پڑھیں گے۔ چنانچہ وہیں جا کر پڑھی۔

❑❑❑

درسِ قرآن

[جامع مسجد شہر اعظم گڑھ]

نبی کریم ﷺ اور ازواجِ مطہرات

الحمدلله رب العالمین والصلوة والسلام علی سید المرسلین وعلی آله وصحبه اجمعین۔

اَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیَاةَ الدُّنْیَا وَزِیْنَتَهَا فَتَعَالَیْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا ﴿۲۸﴾ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۲۹﴾ یَا نِسَآءَ النَّبِیِّ مَنْ یَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ یُضَاعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرًا ﴿۳۰﴾

دینِ اسلام آپ ﷺ کی ذات سے کوئی جدا چیز نہیں ہے:

بائیسواں پارہ ان آیتوں پر ختم ہو رہا ہے۔ یہ رکوع جس کے ایک جز کی ابھی میں نے تلاوت کی ہے، اس میں اللہ تعالی نے ازواج مطہرات کو جو کہ ام المومنین ہیں، کچھ ہدایتیں دی ہیں۔ اور یہ ہدایتیں براہ راست رسول اللہ ﷺ کی عظمت اور تعظیم سے متعلق ہیں۔ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کی تعظیم درحقیقت دینِ اسلام کی تعظیم ہے، اللہ کی تعظیم

ہے۔ دینِ اسلام آپ ﷺ کی ذات سے کوئی جدا چیز نہیں ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی زندگی، آپ کا اسوۂ حسنہ، آپ کا طریقہ، یہی دین ہے۔ اس لیے جو رسول اللہ ﷺ کے حقوق کو جتنا بجالائے گا وہ اتنا ہی دین پر قایم اور مستقیم ہوگا۔ دور اور نزدیک کے سارے لوگ بہر حال رسول اللہ ﷺ سے مربوط ہیں اور سب کی دینی حالت انھیں سے مربوط ہے۔ اُن سے جتنی دوری ہوگی، دینی حالت میں اتنی ہی کمزوری ہوگی، جتنا اُن سے قرب ہوگا، دینی حالت میں اتنی مضبوطی ہوگی۔

میاں بیوی ایک ہی شخصیت کے دو جز ہوتے ہیں:

قُرب وبُعد کے اعتبار سے لوگوں کی مختلف حالتیں ہوتی ہیں۔ سب سے زیادہ قُرب ظاہری اعتبار سے انسان کو انسان کے ساتھ جو ہوسکتا ہے، وہ بیوی کو اپنے شوہر سے اور شوہر کو اپنی بیوی سے ہوتا ہے۔ اس قرب میں کوئی حجاب نہیں، کوئی پردہ نہیں، سب ایک دوسرے کے احوال سے واقف ہوجاتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ فقہ کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ مرد وعورت جب تک الگ الگ ہیں تب تک دو ہیں۔ جب نکاح ہوگیا تو دونوں مل کر ایک ہوگئے۔ اب یہ دو شخص نہیں، ایک ہی شخص ہے۔ ایک ہی شخصیت کے دو جز ہیں، جیسے انسان کے دو ہاتھ ہوتے ہیں، یہ دونوں الگ الگ نہیں بلکہ ایک ہی ہوتے ہیں۔ آنکھیں بظاہر دیکھنے میں دو ہیں، مگر حقیقت میں ایک ہی ہے، صرف اجزا دو ہیں۔ ایسے ہی نکاح ہونے کے بعد مرد وعورت ایسے ہوجاتے ہیں کہ ان کی دُوئی مٹ جاتی ہے اور اکائی کے دو جز ہوجاتے ہیں۔ ایک جز مرد اور ایک جز عورت۔ یہی وجہ ہے کہ فقہا نے لکھا ہے کہ 'اولاد کے بارے میں یہ نہیں کہا جائے گا کہ آدھی مرد کی ہے اور آدھی عورت کی ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے گا کہ پورا بیٹا مرد کا ہے اور پورا بیٹا عورت کا ہے۔' اس کا مطلب ہے کہ دونوں ایک ہوگئے ہیں۔ اگر ایک نہ ہوتے، الگ ہوتے تو ضرور بیٹے کی بھی تقسیم ہوجاتی۔

ظاہر سی بات ہے کہ ایک ہی جسم کے دو اجزا، ایک ہی شخصیت کے دو رخ میں

جتنا قرب ہوگا، کسی اور فرد میں اتنا قرب نہیں ہوسکتا ہے۔اسی لیے ظاہری اعتبار سے عورت کو شوہر کے ساتھ اور شوہر کو عورت کے ساتھ جو قرب ہے، وہ کسی کو نہیں ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ایک کو دوسرے سے جو خوشی اور راحت ہے، وہ کسی اور کے ساتھ حاصل نہیں ہوسکتی ہے۔اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں کہ:هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ۔ [البقرہ:۱۸۷]عورت تمھارا ملبوس ہے اور تم عورت کے ملبوس ہو۔

جب یہ ہے تو اس کا دوسرا رخ بھی ہوگا، یعنی تکلیف بھی جب ہونے پر آتی ہے تو ایک کو دوسرے سے اتنی تکلیف پہنچ جاتی ہے کہ دوسروں سے اتنی تکلیف نہیں پہنچ سکتی ہے۔ بہر حال! شخصیت تو الگ الگ ہی ہے۔دونوں میں کسی کی طرف سے زیادتی ہوجائے تو وہ ایذا کا سبب بنتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ حدیث میں آتا ہے کہ ’کوئی عورت اپنے شوہر کو تکلیف پہنچاتی ہے اور شوہر نیک ہوتا ہے، تو جنت کی حوریں کہتی ہیں کہ کچھ دنوں کے لیے تم کو مل گیا ہے تو کیوں ستا رہی ہو؟ ایک دن تمھیں چھوڑ کر ہمارے پاس آجائے گا‘ وہ گویا ان عورتوں سے خطاب کرتی ہیں جو اپنے شوہروں کو ستاتی ہیں۔اور اگر شوہر اپنی بیوی کو تکلیف پہنچائے تو قرآن اور حدیث میں اس کی بہت سی وعیدیں آئی ہیں۔

بہر حال! ان دونوں میں جتنا قرب ہے، اتنا کہیں نہیں ہے، ایک کو دوسرے سے جتنی راحت ہے اور کہیں نہیں ہے۔اور اسی قیاس پر ایک کو دوسرے سے جو تکلیف پہنچ سکتی ہے، کسی کو کسی سے نہیں پہنچ سکتی ہے۔شوہر کے لیے عورت کی رعایت کرنی ضروری ہے۔اللہ تعالی فرماتے ہیں:وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔ [النساء:۱۹]ان کے ساتھ معاشرت اور معاملہ ایسا رکھو جو معروف ہے۔ایسا بہتر معاملہ جس کو لوگ جانتے پہچانتے ہوں کہ ہاں عورت کے ساتھ ایسا ہی معاملہ ہونا چاہیے۔وَإِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ[النساء:۱۹] اگر چہ تم کو ان کی کوئی چیز ناپسند آرہی ہو، تب بھی ان کے ساتھ اچھا معاملہ رکھو۔

انسان کو نرا جذباتی محبت کرنے والا شوہر نہیں بننا چاہیے:

آدمی کو شوہر ہونے سے پہلے دین دار اور اللہ ورسول کا وفادار ہونا چاہیے۔

صرف نرا جذباتی محبت کرنے والا شوہر نہیں ہونا چاہیے۔ جذباتی محبت اور معاشرتی دباؤ کی وجہ سے آدمی مار کھا جاتا ہے۔ ایک آدمی دین دار رہنا چاہتا ہے، مگر اس کی بیوی دین دار نہیں ہے، تو ایسی بیوی کے چکر میں اس کی بھی دین داری داؤ پر لگ جاتی ہے۔ بیوی کچھ کہے گی اور یہ اس کے جذبات کی حفاظت میں اس کو ٹال نہیں پائے گا، اور اگر ٹال بھی دے گا تو عورت ایسے حربے استعمال کرے گی کہ پھر اس کے لیے ٹالنا مشکل ہو جائے گا۔ یہی صورت شوہر کی طرف سے بھی ہو سکتی ہے۔ اسی لیے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ 'ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگ اپنے گھر والوں کی وجہ سے اپنے دین کو برباد کر لیں گے'۔ ایک آدمی دین دار بننا چاہے گا مگر اس کی بیوی، اس کے گھر والے طعنہ دیں گے تو وہ مجبور ہو کر کہے گا کہ 'اچھا ٹھیک ہے، ہم بھی دنیا کما کر دکھاتے ہیں'۔ اور جب وہ دنیا کما کر دکھانے کے چکر میں پڑتا ہے تو سب سے پہلے دین ہی داؤ پر لگتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ آدمی کا دین برباد ہو کر رہ جائے گا۔

جہاں آپس میں ایک دوسرے سے بہت محبت و تعلق ہے، وہیں ایک دوسرے سے تاثر بھی بہت ہے۔ سب کی بات ٹالی جا سکتی ہے مگر بیوی کی بات نہیں ٹالی جا سکتی، اور ٹالنا بھی نہیں چاہیے۔ جس کا ساتھ روز کا ہے، اس کی دل جوئی ضروری ہے۔ اگر اُس کی دل جوئی نہیں کی تو آدمی کی زندگی مصیبت بن کر رہ جائے گی۔ لیکن دل جوئی کی بھی ایک حد ہے، اور وہ حد یہ ہے کہ دائرۂ شریعت میں ہو۔ اگر شریعت کے دائرہ کے باہر دل جوئی کی تو دونوں گنہ گار رہوں گے۔

رسول اللہ ﷺ کا ازواج کے ساتھ معاملہ:

زن و شو کا یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بھی تھا۔ آپ کے ساتھ بھی ازواج تھیں۔ راحت و تکلیف کا معاملہ آپ کے ساتھ بھی تھا۔ ایک مرتبہ آپ کے ساتھ ایسا واقعہ پیش آیا تھا، اور یہ واقعہ کوئی گناہ کا واقعہ نہیں تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ ازواجِ مطہرات کی طرف سے کوئی گناہ ہوا ہو، بس شانِ پیغمبری اور بیتِ نبوت کی شان کے خلاف تھا۔ اور

حضور ﷺ کے یہاں اس کا کوئی معنی نہیں تھا کہ لوگوں کی دنیا کی وجہ سے آپ کوئی تاثر لے لیں اور اپنے دین میں کوئی کمزوری درآنے دیں۔ آپ ہی تو دین تھے، اگر اس میں کوئی کمزوری، کوئی خلل آجاتا تو دین مشتبہ ہوجاتا۔

حضور ﷺ کا اپنی ازواج کے ساتھ جو معاملہ تھا، وہ وہی معروف معاملہ تھا، جس کا قرآن نے حکم دیا ہے۔ آپ کی بیویاں بھی عام عورتوں کی طرح آپ سے روٹھا کرتی تھیں، بحیثیت بیوی اپنا زور دکھایا کرتی تھیں، آپ سے مطالبہ اور فرمائشیں کیا کرتی تھیں۔ حضرت عائشہ پر جب تہمت لگی تھی اور حضور ﷺ نے تہمت کا تصفیہ ہونے تک ان کو میکے بھیج دیا تھا۔ بات پورے مدینہ میں پھیل چکی تھی۔ حضور ﷺ پر جب آیت برأت نازل ہوئی تو حضرت عائشہ کی والدہ نے حضرت عائشہ سے کہا کہ 'حضور ﷺ کے سامنے [بطور] شکر یہ کھڑی ہو جاؤ۔ تمھاری برات ہو چکی ہے۔' تو انھوں نے بطور ناز کہا تھا کہ 'نہیں اللہ کی قسم! میں آپ کے سامنے نہیں کھڑی ہوں گی، میں اللہ عزوجل کے سوا اور کسی کی حمد و ثنا نہیں کروں گی۔' [بخاری:۴۱۴۱]

یہ کیا تھا؟ یہ بیوی ہونے کا ناز تھا اور یہ گوارہ کیا گیا۔ اس پر کوئی عتاب نہیں ہوا۔

رسول اللہ ﷺ کی عسرت اختیاری تھی:

وہ خاص واقعہ جس کا اوپر ذکر ہوا ہے، وہ یہ تھا کہ ایک خاص موقع سے ازواج مطہرات نے روزمرہ کے خرچ میں وسعت کا مطالبہ کر دیا تھا۔ یہ مطالبہ خیبر کے بعد ہوا تھا، اور خیبر کے بعد مسلمانوں میں خوش حالی آگئی تھی۔ حضور ﷺ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ عسرت و تنگ دستی میں گزارا، اور اس عسرت میں ازواج بخوشی و رضامندی شریک رہیں۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ آپ کی یہ عسرت اضطراری نہیں بلکہ اختیاری تھی۔ حضرت جبریل اللہ کی طرف سے ایک مرتبہ پیغام لے کر آئے تھے کہ 'اللہ نے آپ کو اختیار دیا ہے، اگر آپ چاہیں تو سونے اور چاندی کے خزانے آپ کے پیچھے لگا دیے جائیں، جیسے چاہیں آپ اُس میں تصرف کریں، آپ پر کوئی روک ٹوک، کوئی پابندی نہیں

ہوگی، جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ نے اجازت دی تھی۔اور اگر چاہیں تو اسی فقر و فاقہ کی زندگی میں گزر بسر کریں۔'

یہ اختیار والا مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہوتا ہے۔فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ آخر چاہیں کیا؟اور اس میں یہ بھی نزاکت ہوتی ہے کہ جس نے اختیار دیا ہے، اُس کی منشا کیا ہے؟ اس کو بھی سمجھنا پڑتا ہے۔جب یہ اختیار ملا تو حضور ﷺ بطور مشورہ حضرت جبریل کی طرف دیکھنے لگے کہ 'آپ کی رائے کیا ہے؟' حضرت جبریل نے اشارہ کیا کہ 'تواضع اختیار کریں۔' آپ نے فرمایا کہ 'بس تو ٹھیک ہے، یہی بہتر ہے کہ صبح کا کھانا رہے تو شام کا نہ رہے، اور شام کا رہے تو صبح کا نہ رہے، تاکہ اللہ سے مانگنا پڑے۔' اَللّٰھُمَّ ارْزُقْ آلَ مُحَمَّدٍ قُوْتاً۔ [بخاری: ٦٤٦٠] اے اللہ! آپ آل محمد کی روزی قوت بنایئے۔یعنی بس بقدر ضرورت کھانے کو ہو اس سے زیادہ نہ ہو۔

عسرت نبی ﷺ نے خود اختیار کی تھی، اور آپ کے یہاں یہی قصہ چلتا رہتا تھا۔ کبھی فاقہ ہے تو کبھی کھانا ہے۔روایتوں میں آتا ہے کہ فجر کی نماز کے کچھ دیر کے بعد آپ گھر میں تشریف لے جاتے اور پوچھتے کہ 'کھانے کو کچھ ہے؟' اگر گھر میں کچھ ہوتا تو پیش کر دیا جاتا، آپ تناول فرمالیتے۔اور اگر معلوم ہوتا کہ کچھ نہیں ہے تو فرماتے کہ 'ٹھیک ہے، آج میں روزہ رکھ لیتا ہوں، اور روزہ کی نیت کر لیتے۔' روزہ کی نیت دوپہر سے پہلے پہلے کی جاسکتی ہے۔

کیا کوئی بڑا حاکم ایسا کرسکتا ہے؟ کھانے کے لیے کچھ نہ ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ہم جیسے غریبوں کے یہاں بھی ہمیشہ کچھ نہ کچھ کھانے کے لیے رہتا ہے۔ جس دن گھر والوں نے کہہ دیا کہ کچھ نہیں ہے تو پھر قیامت آجائے گی۔عورتیں الگ چلائیں گی کہ اس گھر میں تو فاقہ ہے۔مرد کی بدحواسی الگ ہوگی کہ یا اللہ! اب وہ وقت آگیا ہے کہ کھانے بھر نہیں ہے۔مگر حضور ﷺ کا رنگ دوسرا تھا، کھانے کو ہے تو ٹھیک اور اگر نہیں ہے تو پھر روزہ رکھ لیتے۔

حضور ﷺ کے اس عمل کی پیروی آپ کی امت میں کثرت سے لوگوں نے کی ہے۔صحابہ کرام کے یہاں فاقہ کا یہ عمل بہت ہوتا تھا۔ مال ہوتا تو بانٹ کر فاقہ کرتے۔ حضرت عائشہ کے پاس ایک مرتبہ حضرت امیر معاویہ نے مال بھیجا،تھوڑا نہیں بہت زیادہ بھیجا۔حضرت عائشہ نے اسے بانٹنا شروع کیا تو ایک ہی دن میں کل بانٹ دیا۔ جب ختم ہوگیا تو باندی نے کہا کہ ’آپ نے سب بانٹ دیا، افطار کے لیے بھی کچھ نہیں ہے۔‘ فرمایا کہ اللہ کی بندی یہ بات پہلے بتانی چاہیے تھی۔

خود حضور ﷺ کا یہ رنگ تھا کہ عشا کی نماز پڑھانے کے لیے مصلی پر کھڑے ہوئے ،تکبیر کہی جا رہی اور آپ اچانک مصلی سے گھر میں تشریف لے گئے اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آ گئے اور نماز پڑھائی۔نماز کے بعد اس کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا کہ ’نماز کے لیے جب میں کھڑا ہوا تو یاد آیا کہ گھر میں کچھ سونا رکھا ہوا ہے، میں جلدی سے گھر میں جا کر کہا کہ اسے فوراً صدقہ کیا جائے۔مناسب نہیں ہے کہ نبی کے گھر میں رہے۔‘ جب اطمینان ہوگیا کہ اب صدقہ ہو جائے گا تو میں نے نماز پڑھائی۔ جہاں یہ رنگ ہو وہاں مال کا کیا گزر؟

فتح خیبر اور صلح حدیبیہ کے بعد:

ابتدا میں تنگی سارے مسلمانوں کے یہاں تھی، لوگ تنگی میں گزر اوقات کرتے تھے۔لیکن غزوۂ خندق کے بعد اللہ کی طرف سے کئی وعدے ہوئے۔اس میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ’تم لوگوں کو ایسی جگہ زمین ملے گی جہاں ابھی نہیں پہنچے ہو۔‘ چنانچہ یہ وعدہ وفا ہوا اور خیبر فتح ہوا۔فتحِ خیبر کے بعد رسول اللہ ﷺ کے پاس بہت مال آیا۔اس کے بعد حدیبیہ کی صلح ہوئی۔صلح کی وجہ سے جنگ بندی ہوئی تو اس کے نتیجہ میں آپس میں تجارتی کاروبار شروع ہو گئے،تو اس طرف سے بھی آمدنی ہونے لگی۔مسلمانوں کو جب اطمینان ہو گیا کہ اب لڑائی نہیں ہوگی تو لوگ ذرا قاعدہ سے کھیتی باڑی بھی کرنے لگے،تو اس سے بھی مال میں اضافہ ہوا۔ ہر گھر میں کچھ نہ کچھ فراوانی کا اثر آ گیا تھا۔حضراتِ ازواجِ مطہرات نے

سوچا کہ مال کی فراوانی تو ہوگئی ہے، مگر ہم اب بھی اسی حال میں ہے۔ تمام فراوانی کے باوجود حضور ﷺ کا حال نہیں بدلا تھا، آپ کے یہاں فراوانی اب بھی نہیں تھی۔ تو ازواجِ مطہرات نے آپس میں مشورہ کیا کہ حضور ﷺ سے کہنا چاہیے کہ 'کچھ ہمارا بھی نفقہ بڑھا دیں، تا کہ کچھ آسانی ہو جائے۔' چنانچہ ان لوگوں نے حضور ﷺ سے اس کی درخواست کی۔ بیویاں تھیں، ان کو شوہر سے کہنے کا حق ہے، ناز کا ایک تعلق ہوتا ہے، سو ان لوگوں کہا۔ مگر نظر بظاہر اس درخواست سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان کو دنیا کی آسایش چاہیے۔ اس لیے یہ بات رسول اللہ ﷺ کو ناگوار گزری۔ آپ صرف شوہر ہی نہیں تھے بلکہ اللہ کے رسول بھی تھے۔ اگر آپ صرف شوہر ہوتے تو گنجایش ہوسکتی تھی، مگر آپ اللہ کے رسول ہیں، جو کچھ کرتے ہیں، اللہ کے حکم کے مطابق کرتے ہیں۔ اس لیے یہ مطالبہ بے محل ہو گیا جس کی وجہ سے آپ کو ناگواری ہوگئی۔ اس ناگواری میں آپ نے ان لوگوں سے علاحدگی اختیار کر لی، اور ایک چھوٹا سا مکان نما کمرہ تھا، اس میں تشریف لے گئے۔ ازواج کے پاس آنا جانا بند کر دیا۔

اب یہ بات مدینہ طیبہ میں پھیل گئی۔ منافقین نے افواہ پھیلانی شروع کر دی کہ آپ نے ازواج مطہرات کو طلاق دیدی۔ ظاہر سی بات ہے کہ کوئی معتبر و مقتدا آدمی طلاق دیدے تو یہ بہت بھاری بات ہوگی۔ اور یہ زمانہ صلح والا چل رہا تھا جس میں کوئی جنگ درپیش نہیں تھی۔ اتفاق سے حضرت عمر تھے نہیں، کہیں گئے ہوئے تھے۔ واپس آئے تو انھوں نے سنا کہ حضور ﷺ نے طلاق دیدی ہے تو بہت پریشان ہوئے۔ اس کمرے کے پاس پہنچے جہاں آپ کا قیام تھا۔ حضور ﷺ اندر تشریف فرما تھے، اور باہر آپ کے آزاد کردہ غلام بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت عمر نے ان سے کہا کہ 'حضور ﷺ سے اجازت لے لیں، میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔' وہ اندر گئے اور عرض کیا کہ 'حضرت عمر حاضر ہونا چاہتے ہیں۔' آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انھوں نے آکر کہہ دیا کہ 'کوئی جواب نہیں دے رہے ہیں۔' حضرت عمر وہیں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر کہلوایا، مگر آپ نے پھر

کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد تیسری مرتبہ کہلوایا تو حاضری کی اجازت مل گئی۔ حضرت عمر اندر گئے، کچھ دیر بیٹھے، باتیں کی، باتوں باتوں میں پوچھ لیا کہ ’آپ نے ازواج کو طلاق دیدی ہے؟‘ آپ نے فرمایا کہ ’نہیں‘۔ حضرت عمر مطمئن ہوگئے۔ وہاں سے نکلے تو سیدھے اپنی بیٹی حضرت حفصہ کے پاس گئے، جو آپ ﷺ کے نکاح میں تھیں۔ اوران کوسرزنش کی کہ تم لوگوں نے کیا کردیا؟ سراپا تابع دار بن کر رہنا چاہیے۔

بہرکیف! پھر اللہ کی طرف سے یہ آیت اتری جس کی میں نے تلاوت کی ہے۔ اللہ تعالی نے بھی یہ منظور نہیں کیا کہ ان کا نفقہ بڑھایا جائے یا ان کو آسایش کا سامان مہیا کیا جائے۔آیت نازل ہوئی: يَا اَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا۔ اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تم کو دنیاوی آسایش چاہیے، دنیا کا مال ومنال چاہیے، دنیا کی راحت چاہیے تو آؤ میں تمھیں کچھ دے دیتا ہوں اور میں تمھیں بہت اچھے طریقے سے چھوڑ دیتا ہوں۔ تمھارے اوپر ہماری طرف سے کوئی مواخذہ، کوئی سرزنش نہیں ہے۔ اس لیے کہ میرے ساتھ رہنے میں یہ بات نہیں چلے گی کہ میں تمھیں دنیا کی آسایش دوں۔ میرے ساتھ تو جیسے میں ہوں، ویسے ہی تمھیں بھی رہنا ہے۔ ساری امت میں نمونہ حضور ﷺ ہیں تو ساری امت کی عورتوں کے لیے ان کو نمونہ بننا ہے۔ اس لیے یہ سب مطالبات مناسب نہیں ہیں۔

وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ۔ اور اگر تم اللہ کو چاہتی ہو اور رسول کو چاہتی ہو۔ یعنی مقصد تمھارا دنیا کی آسایش نہیں ہے، تمھارا مقصد اللہ کی رضا ہے، تو اللہ کی رضا کا طریقہ یہ ہے کہ رسول کو راضی رکھو، اور رسول کے ساتھ رہو، ان کے نکاح سے الگ نہ ہوؤ۔ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ۔تو تم میں سے جو نیکی کرنے والی، اچھا کام کرنے والی ہیں، ان کے لیے اللہ نے بہت بڑا اجر تیار کیا ہے۔ اور یہ خود بہت بڑی نیکی ہے کہ رسول کی زوجیت میں ہو۔ اگر تم اس کو منظور کر لیتی ہو

تو تمھارے لیے بہت کچھ ہے۔

ازواج مطہرات کا حسنِ انتخاب:

اس آیت کو ’’ آیتِ تخییر‘‘ کہتے ہیں۔یعنی ازواج کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ چاہیں تو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہیں، اور اگر نہ رہنا چاہیں تو بہت آسانی سے طلاق مل جائے گی۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور ﷺ سب سے پہلے حضرت عائشہ کے پاس گئے۔ کیوں کہ آپ کو ان سے بہت محبت و تعلق تھا، اور پھر ان کے والد حضرت ابو بکر صدیق آپ کے سب سے قریبی اور آپ کے سب سے زیادہ مددگار تھے۔حضور ﷺ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہاں تک فرمایا ہے کہ ’جتنے لوگوں نے مجھ پر احسان کیے ہیں، میں نے سب کا بدلہ دے دیا ہے، سوائے ابو بکر کے۔‘[ترمذی: ٣٦٦١]حضرت عائشہ سے کہا کہ ’دیکھو! میں تم سے ایک بات کہنے والا ہوں، جواب دینے میں جلدی مت کرنا۔ پہلے اپنے والدین سے مشورہ کرلینا، اس کے بعد ہی کچھ جواب دینا۔‘ حضرت عائشہ سمجھ گئیں کہ ’بات کچھ ٹیڑھی ہے، تبھی والدین کے پاس مشورہ کے لیے جانے کو کہہ رہے ہیں۔‘ انھوں نے عرض کیا ’حضرت! فرمایئے کیا بات ہے؟‘ تو آپ نے یہ آیت پڑھ کر سنا دی۔حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ ’اس کے لیے والدین سے مشورہ کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے آپ سے علاحدہ ہونا ہرگز منظور نہیں ہے، میں آپ کے ساتھ ہی رہوں گی۔ مجھے دنیا نہیں، دارِ آخرت چاہیے۔‘ حضور ﷺ ان کے اس جواب سے بہت خوش ہوئے۔ پھر اس کے بعد وہ کہتی ہیں...... تھیں تو عورت ہی نا، اب عورت ہونا غالب آرہا ہے...... ’آپ ساری ازواج سے یہ بات کہیں گے، جیسے مجھ سے کہا، تو اُن کو میرا جواب مت بتایئے گا۔‘ حضور نے فرمایا کہ ’نہیں، اگر کوئی مجھ سے پوچھے گا تو میں بتادوں گا۔‘ اس لیے کہ پیغمبر کا یہ منصب نہیں ہے کہ کسی کی جانب داری کرے۔ خیر اس کے بعد آپ نے ساری ازواج کو یہ آیتیں سنائی۔ سب کی سب آپ کی تربیت یافتہ تھیں، بھلا ان میں سے کون ہوسکتا ہے جو یہ کہے کہ مجھے آپ کے ساتھ نہیں رہنا ہے، مجھے

دارِ آخرت نہیں چاہیے؟ کسی نے کچھ نہیں سوچا، سب نے بے تکلف ایک ہی جواب دیا کہ ’ہمیں آپ کے ساتھ رہنا ہے، ہمیں دارِ آخرت چاہیے۔ ہم سے غلطی ہوگئی جو ہم نے آپ سے اس طرح کا مطالبہ کردیا۔‘

مال وآسایش کو مقصود بنانا کسی لیے جائز نہیں:

یہ تھیں ازواج مطہرات اوران کی تعلیم وتہذیب۔ اس تعلیم میں پوری امت کی تعلیم پنہاں ہے کہ حضور ﷺ جیسا چاہتے ہیں ویسے ہی رہیے۔ آپ نے مال ودولت سے منع نہیں فرمایا ہے، لیکن دولت کے حق کو ادا کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ اوراس کا حق دوطرح کا ہوتا ہے۔ آنے میں بھی اور جانے میں بھی۔ دولت کس راستہ سے آرہی ہے؟ اور کس راستہ سے جارہی ہے؟ ان دونوں کا حق ہے، قدغن لگی ہوئی ہے، حضور ﷺ کی طرف سے ہدایت لگی ہوئی ہے کہ دونوں کو دیکھنا ہے۔ اب ہر مسلمان حضور ﷺ کی منشا کو دیکھے اوران کی منشا کے مطابق جو مال ہو، اس کو لے، ورنہ جیسا بھی ہو، اس کو ہٹادے۔ اصل دین یہی ہے کہ منشاے نبوت کو آدمی پہچانے۔ اگر اللہ اوراس کے رسول کی رضا اور دارِ آخرت مقصد ہے تو اس کو وہی کرنا ہوگا جو اللہ اوراس کے رسول چاہتے ہیں۔ دنیا کی آسایش کا ارادہ نہیں کرنا ہے۔ اللہ اگر دیدے تو ٹھیک ہے، عطیہ الٰہی ہے، قبول ہے، لیکن ہم اس کو مقصود نہیں بناسکتے۔ اگراس کو مقصود بنانا کسی کے لیے جائز ہوتا تو ازواجِ مطہرات کے لیے بالکل جائز ہوتا۔ دیکھیے ان کے لیے جائز نہیں تو پھر کسی کے لیے بھی جائز نہیں ہے۔

فاحشة مبينة سے کیا مراد ہے؟:

پھر آگے فرماتے ہیں: يَا نِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَأْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۔ اے نبی کی عورتو! جو تم میں سے کھلا ہوا برا کام کرے گی۔ یہاں برے کام سے مراد رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی ہے، رسول کو تکلیف پہنچانا ہے، ان سے ایسا مطالبہ کرنا ہے جو ان کو ناگوار ہو، جس کی وجہ سے انھیں گرانی ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدانخواستہ، اللہ نہ کرے کوئی بدکاری وغیرہ۔ انبیا کی بیویوں کو اللہ نے بدکاریوں سے محفوظ رکھا ہے۔ کفر تو

ہوا ہے، مگر ظاہری بدکاریاں نہیں ہوئی ہیں۔مفسرین نے لکھا ہے کہ ’اس سے مراد ایسا سوال ہے جو آپ پر گراں گزرے، جسے آپ پسند نہ کرتے ہوں۔‘

ازواج مطہرات کی دو حیثیت ہے: مومن ہونا اور نبی کی بیوی ہونا:

یُضَاعَفُ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا۔ تو اس کو دُہرا عذاب دیا جائے گا۔ازواج مطہرات کی بڑی حیثیت ہے، اور جس کی حیثیت بڑی ہوتی ہے، اس کی غلطی بھی اس کی حیثیت کے اعتبار سے بڑی ہو جاتی ہے۔ایک تو مومن ہونا اور پھر نبی کی بیوی ہونا، یہ ڈبل حیثیت ہے۔مومن ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی گناہوں سے بچے اور نبی کی بیوی ہونے کا تقاضا ہے کہ مزید اس کا اہتمام کرے، ذرا سی غفلت یا چوک اور سستی نہ ہونے پائے، ورنہ یُضَاعَفُ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ۔ عقاب دوہرا ہو جائے گا۔

وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۔اور یہ بات اللہ کے اوپر آسان ہے۔اللہ کے اوپر کسی کا دباؤ نہیں ہے، یہ اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔

بہر حال ازواج کو اس بات کی ہدایت کی گئی ہے کہ تمھاری وجہ سے نبی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ یہ گھر کے خاص الخاص لوگ ہیں جن کا حضور ﷺ کے ساتھ ناز کا تعلق ہے، ان کو یہ ہدایت دی جارہی ہے۔اب پوری امت سوچ لے کہ ہم کو حضور ﷺ کے ساتھ کس درجہ تابع داری کا معاملہ کرنا چاہیے۔ ہمارے کسی عمل کی وجہ سے، ہمارے کسی کام کی وجہ سے آپ کو ایذا پہنچے، یہ کس درجہ کا جرم ہوگا؟ اور کس قدر نامناسب بات ہوگی؟ اللہ تعالی ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔

❑❑❑

درسِ قرآن
[جامع مسجد شہر اعظم گڑھ]

عورتوں کے لیے خصوصی احکام وآداب

الحمدلله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله وصحبه اجمعين۔

اَعُوۡذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطَانِ الرَّجِیۡم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

وَمَنۡ یَقۡنُتۡ مِنۡکُنَّ لِلّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ وَتَعۡمَلۡ صَالِحًا نُؤۡتِہَا اَجۡرَہَا مَرَّتَیۡنِ وَاَعۡتَدۡنَا لَہَا رِزۡقًا کَرِیۡمًا﴿۳۱﴾ یَا نِسَآءَ النَّبِیِّ لَسۡتُنَّ کَاَحَدٍ مِنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیۡتُنَّ فَلَا تَخۡضَعۡنَ بِالۡقَوۡلِ فَیَطۡمَعَ الَّذِیۡ فِیۡ قَلۡبِہٖ مَرَضٌ وَقُلۡنَ قَوۡلًا مَعۡرُوۡفًا﴿۳۲﴾ وَقَرۡنَ فِیۡ بُیُوۡتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجۡنَ تَبَرُّجَ الۡجَاہِلِیَّۃِ الۡاُوۡلٰی وَاَقِمۡنَ الصَّلَاۃَ وَآتِیۡنَ الزَّکَاۃَ وَاَطِعۡنَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ وَیُطَہِّرَکُمۡ تَطۡہِیۡرًا﴿۳۳﴾ وَاذۡکُرۡنَ مَا یُتۡلٰی فِیۡ بُیُوۡتِکُنَّ مِنۡ اٰیَاتِ اللّٰہِ وَالۡحِکۡمَۃِ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ لَطِیۡفًا خَبِیۡرًا﴿۳۴﴾ اِنَّ الۡمُسۡلِمِیۡنَ وَالۡمُسۡلِمَاتِ وَالۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَالۡمُؤۡمِنَاتِ وَالۡقَانِتِیۡنَ وَالۡقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِیۡنَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِیۡنَ وَالصَّابِرَاتِ وَالۡخَاشِعِیۡنَ وَالۡخَاشِعَاتِ وَالۡمُتَصَدِّقِیۡنَ وَالۡمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّآئِمِیۡنَ وَالصَّآئِمَاتِ وَالۡحَافِظِیۡنَ فُرُوۡجَہُمۡ وَالۡحَافِظَاتِ وَالذَّاکِرِیۡنَ اللّٰہَ کَثِیۡرًا وَالذَّاکِرَاتِ اَعَدَّ اللّٰہُ لَہُمۡ مَغۡفِرَۃً وَاَجۡرًا عَظِیۡمًا﴿۳۵﴾

رسول اللہ ﷺ کی معاشی کیفیت:

یہاں سے بائیسواں پارہ شروع ہو رہا ہے۔اس کے ابتدا میں ازواجِ مطہرات کا تذکرہ ہے۔اس رکوع کا ایک حصہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔مسئلہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی جو معاشی زندگی تھی، وہ ہمیشہ ایسی رہی ہے کہ خود حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ: مَا شَبِعَ آلُ مُحَمَّدٍ يَوْمَيْنِ مِنْ خُبْزٍ اِلَّا وَاَحَدُهُمَا تَمْرٌ۔ [مشکوۃ:۴۱۹۳] محمد ﷺ کی آل نے دو دن [مسلسل] گندم کی روٹی سیر ہو کر نہیں کھائی، ان دو [دنوں] میں سے ایک دن کھجور ہوتی تھی۔اسی طرح حضرت عائشہ کی دوسری حدیث ہے: تُوُفِّیَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَمَا شَبِعْنَا مِنَ الاَسْوَدَيْنِ۔ [متفق علیہ] رسول اللہ ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے اور ہم نے [آپ کی حیات مبارکہ میں کبھی] دو سیاہ چیزوں [کھجور اور پانی] سے پیٹ نہیں بھرا۔

ظاہر سی بات ہے کہ یہ معیشت ایک تنگی کی معیشت ہے۔ہم لوگ کہتے ہیں کہ 'بھائی! غربت اور تنگی میں ہم گزر بسر کرلیں گے، مگر ہمارے گھر والے کیسے رہیں گے؟ ہم اکیلے تو ہیں نہیں، بیوی ہے، بچے ہیں۔' تو اسی طرح حضور ﷺ کے یہاں بھی بیویاں تھیں اور اولاد تھیں۔اور عورتوں کی جو طبیعت ہوتی ہے، وہ بھی وہاں موجود تھی، لیکن رسول اللہ ﷺ نے ایسی تربیت فرمادی تھی کہ اسی تنگی و عسرت میں گزارہ کررہی تھیں، کسی کو کوئی شکایت نہیں تھی۔

آپ ﷺ کا حال یہ تھا کہ فجر کی نماز کے کچھ دیر بعد گھر تشریف لاتے اور پوچھتے کہ 'کھانے کو کچھ ہے؟' گھر والے کہتے 'ہاں' تو آپ کچھ تناول فرمالیتے اور اگر گھر والوں نے کہا 'نہیں' تو آپ فرماتے کہ 'ٹھیک ہے، تو آج میرا روزہ ہے۔' [مشکوۃ] پھر دن بھر کھانے پینے کا کوئی تقاضہ ہی نہیں۔یہ سلسلہ مسلسل چلتا رہتا۔

غزوۂ احزاب کے بعد جس کا تذکرہ تفصیل سے پیچھے گزر چکا ہے، ایک اور جنگ ہوئی تھی، 'جنگِ خیبر'۔خیبر یہودیوں کی آبادی تھی، جہاں ان کی کھیتی باڑی اور باغات وغیرہ تھے۔ان لوگوں نے شرارت کی تو مسلمانوں نے اللہ کے حکم سے ان پر چڑھائی

کردی، اور خیبر کو فتح کرلیا۔ وہاں کی زمینیں اور باغات وغیرہ سب مسلمانوں کے قبضہ میں آگئے۔ پھر ان لوگوں سے اس بات پر صلح ہوگئی کہ 'ان کو چھوڑ دیا جائے، جو کچھ پیداوار ہوگی، اس میں سے ایک حصہ مسلمانوں کے دیں گے۔' چنانچہ خیبر کی پیداوار بکثرت آنے لگیں تو مسلمانوں میں معاشی خوش حالی پیدا ہوگئی۔ عام مسلمانوں کے یہاں خوش حالی تو ہوئی، مگر رسول اللہ ﷺ کی معیشت کا وہی حال رہا۔ اور یہ صرف نبی ہی کرسکتا ہے، ورنہ ہم لوگوں کے یہاں تو یہ حال ہے کہ سب سے پہلے خوش حالی امیر اور حاکم صاحب ہی کے یہاں آتی ہے۔ غریب چاہے غریب رہ جائے، مگر حاکم کے یہاں فراوانی رہے گی، ہر طرح کا عیش رہے گا۔

مشہور ہے کہ کسی نے راجہ سے شکایت کی کہ 'صاحب! آپ کی رعایا بہت پریشان ہے، کھانے پینے کو نہیں مل رہا ہے۔' تو راجہ نے تعجب سے کہا کہ 'کیا ہماری رعایا کو پلاؤ قورمہ بھی نہیں مل رہا ہے؟' یعنی سب سے ادنی درجہ کا جو کھانا اس کے دسترخوان پر تھا، وہ یہی تھا۔ سوچا کہ یہ تو رعایا کو میسر ہی ہوگا۔ حالاں کہ وہاں دال روٹی کے لالے پڑے تھے۔

بڑے لوگوں کا حال یہی ہوتا ہے کہ وہ چھوٹوں کی کیفیت جانتے ہی نہیں کہ کس طرح گزارہ ہو رہا ہے۔ مگر رسول اللہ ﷺ کے یہاں معاملہ برعکس تھا۔ جس ہستی اور جس شخصیت کی وجہ سے ساری رونقِ بزمِ جہاں ہے، ان کے یہاں اخیر تک فراوانی نہیں آئی۔ حضرات ازواج کو خیال ہوا کہ ہم لوگوں کو بھی وقت سے کھانا پینا مل جایا کرے، تھوڑی سی فراوانی آجائے۔ اس خیال سے انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے روزمرہ کے خرچ میں تھوڑی سی وسعت کا تقاضا کیا۔ اس تقاضے کے بعد جو کچھ ہوا، اس کا تذکرہ گذشتہ آیات کے ضمن میں گزر چکا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو تنگ دست یا غریب کہنا درست نہیں ہے:

گذشتہ ہفتہ میں ذکر ہوا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے یہاں جو عسرت اور تنگی تھی، وہ

آپ کی اختیاری تھی، اضطراری نہیں تھی۔ اس لیے آپ کو تنگ دست، غریب یا مفلوک الحال کہنا درست نہیں ہے۔ آپ غریب نہیں تھے، آپ کے قدموں پر پوری دنیا کی دولت نثار تھی۔ آپ کے ہاتھوں اللہ جانے کتنا مال لوگوں میں تقسیم ہوا ہے۔ اندازہ کرنے کے لیے اجمالاً ذکر کردوں کہ غزوۂ حنین کے موقع سے ایک ایک فرد کو دو دو سو اونٹ آپ نے دیے۔ ایک اونٹ خریدنے میں زور ہوجاتا ہے، مگر آپ نے ہزاروں اونٹ تقسیم کردیے۔ آپ عشا کی نماز پڑھانے کے لیے مصلے پر کھڑے ہوئے، تکبیر کہی جارہی ہے اور آپ اچانک مصلے سے گھر میں تشریف لے گئے اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آگئے اور نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد اس کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا کہ نماز کے لیے جب میں کھڑا ہوا تو یاد آیا کہ گھر میں کچھ سونا رکھا ہوا ہے، میں جلدی سے گھر میں جاکر کہا کہ 'اسے فوراً صدقہ کیا جائے۔ مناسب نہیں ہے کہ نبی کے گھر میں رہے اور اس پر رات گزر جائے۔' جب اطمینان ہوگیا کہ اب صدقہ ہوجائے گا تو میں نے نماز پڑھائی۔

کہاں غربت تھی؟ غربت ہوتی تو اس طرح مال تقسیم ہوتا؟ بظاہر آپ نے تنگ دستی کی زندگی بسر کی تو یہ آپ کی اختیاری تھی، اللہ کا اشارہ پاکر ہی آپ نے ایسا کیا تھا۔ حضرت جبریل ایک مرتبہ آپ کے پاس پیغام لے کر آئے تھے کہ 'اگر آپ چاہیں تو بادشاہت حاضر ہے، دنیا کا کوئی بادشاہ آپ کا مقابلہ نہیں کرسکتا، اور اگر چاہیں تو بندے بنے رہیں۔' آپ کو یہ اختیار ملا تھا۔

لقمان علیہ السلام کی حکیمانہ بات:

لقمان علیہ السلام ایک مشہور حکیم تھے۔ ان کی نبوت میں اختلاف ہے کہ نبی تھے یا نہیں؟ عام طور سے علما کا رجحان یہ ہے کہ وہ نبی نہیں تھے، حکیم تھے۔ قرآن میں بھی حکمت ہی کا تذکرہ ہے: وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ [لقمان: ۱۲] ہم نے لقمان کو حکمت دی تھی کہ اللہ کا شکر ادا کرو۔ لکھا ہے کہ لقمان علیہ السلام سے کسی نے پوچھا کہ 'حضرت! آپ کو تو نبوت بھی مل رہی تھی اور حکمت بھی، تو آپ نے نبوت کو اختیار

نہیں کیا، حکمت کو اختیار کیا؟ حالاں کہ نبوت کا درجہ بڑا ہے۔' تو حضرت لقمان نے جواب دیا کہ 'اللہ نے کسی کو پوچھ کر نبوت دی ہے؟ جس کو نبی بنانا ہوا بنا دیا، مگر مجھ کو یہ اختیار دیا کہ چاہے نبوت اختیار کرو یا چاہے حکمت لے لو۔ نبوت کا درجہ بڑا ہے، تو یہاں میرے تواضع کا امتحان تھا۔ میں اگر نبوت کو اختیار کرتا تو اس کا مطلب تھا کہ میں بڑا بننا چاہتا ہوں۔ تو اس امتحان میں مجھے یہی کہنا تھا کہ مجھے حکمت چاہیے۔' اور اللہ نے اس بات کو پسند بھی فرمایا۔ خود یہ بہت حکیمانہ بات ہے کہ ایک بڑی اور ایک چھوٹی چیز میں اختیار ملے تو تواضع اختیار کرتے ہوئے چھوٹی چیز کو لے لے۔

تواضع ایک پسندیدہ صفت ہے:

رسول اللہ ﷺ کو اختیار ملا تھا کہ عبدِ نبی بننا چاہتے ہیں یا مَلِکِ نبی؟ نبوت کے ساتھ حکومت چاہیے یا نبوت کے ساتھ بندگی چاہیے؟ آپ کی طبیعت کا فطری تقاضا یہی تھا کہ آپ کہیں کہ مجھے عبدِ نبی بننا ہے۔ حضرت جبریل کی طرف بطور مشورہ کے دیکھا تو ان کا بھی اشارہ تواضع ہی کا تھا۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ 'میں بندہ ہی رہوں گا، مجھے بادشاہت نہیں چاہیے۔' اور پھر اخیر تک آپ کی یہی شان رہی۔ کوئی بادشاہ مقروض ہو کر نہیں مرا، مگر جب آپ دنیا سے تشریف لے جا رہے تھے تو آپ مقروض تھے، اور قرض میں آپ کی زِرَہ...... جنگ میں پہنا جانے والا لوہے کا لباس......رہن رکھی ہوئی تھی۔ آپ کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس پر دولت کا اطلاق ہو سکے، اور جو تھا وہ آپ کے وصال کے بعد خود بخود صدقہ ہو گیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تواضع پسندیدہ چیز ہے۔ اسی لیے ازواج مطہرات کو اختیار دیا جا رہا ہے کہ دنیا چاہیے یا دارِ آخرت؟ اس کی تفصیل گزشتہ آیات کے ضمن میں گزر چکی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی دعا کی تاثیر:

یہاں پر ایک بات اور بتاتا چلوں کہ بظاہر اگرچہ رسول اللہ ﷺ کے پاس مال و

دولت کی فراوانی نہیں تھی، ہاتھ سے دینے کے لیے کچھ نہیں تھا، مگر آپ کے پاس ایک ایسی چیز تھی کہ اس سے نہ جانے کتنے لوگ فارغ البال اور مال دار ہوگئے۔ اگر آپ چاہتے تو اسے اپنے حق میں استعمال کر کے مال و دولت کی فراوانی حاصل کر لیتے، مگر آپ نے اس کے ذریعہ صرف دوسروں کا بھلا کیا۔ اور وہ چیز ہے آپ کی دعا۔ جس کے لیے دعا کر دی، جس کے لیے چاہ لیا، وہ نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔

سیدنا انس بن مالک حضور اکرم ﷺ کے خادمِ خاص ہیں، اور خادم ہی کی حیثیت سے ان کی والدہ نے آپ کی خدمت میں ان کو پیش کیا تھا۔ ان کی والدہ کا نام اُم سلیم تھا، جو رشتہ کے اعتبار سے رسول اللہ ﷺ کی خالہ لگتی تھیں۔ جب حضور ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لے گئے تھے تو لوگ اپنی اپنی حیثیت کے اعتبار سے کچھ نہ کچھ پیش کر رہے تھے۔ حضرت اُم سلیم آئیں تو انھوں نے عرض کیا کہ 'یا رسول اللہ! میرے پاس دینے کے لیے تو کچھ ہے نہیں، یہ میرا بیٹا ہے، بہت سمجھ دار ہے، اس کو آپ اپنی خدمت میں رکھ لیں۔' اس وقت حضرت انس کی عمر دس سال تھی۔ بیس سال کی عمر تک رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں رہے۔ ایک دن آپ ان کی خدمت سے بہت خوش ہوئے اور دعا کی کہ 'یا اللہ! انس کے مال میں برکت دیجیے، اور اس کی اولاد میں برکت دیجیے۔' دو چیزوں میں برکت کی دعا کی۔ اولاد کی برکت کا یہ حال ہوا کہ ان کی اتنی اولادیں ہوئیں کہ مدینہ شہر میں رہنے کی گنجائش ختم ہوگئی تو مدینہ کے باہر جا کر انھوں نے ایک قلعہ نما عمارت بنائی، اور اس میں رہتے تھے۔ اولاد کی روزآنہ حاضری ہوتی تھی کہ کل ہیں یا نہیں؟ بیٹے پوتے کثیر تعداد میں تھے۔

اور مال کی برکت کا یہ حال ہوا کہ سب کی فصلیں ایک مرتبہ بارآور ہوتیں تھیں اور ان کی فصل دو مرتبہ ہوتی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ روایتوں میں آتا ہے کہ 'ایک مرتبہ فصل میں پانی کی ضرورت تھی اور پانی کا انتظام نہیں تھا، اور بارش بھی نہیں ہو رہی تھی۔ سینچائی نہ ہو تو فصل سوکھ جاتی ہے۔ تو خادم جو کھیتی کے کام پر مامور تھا، وہ آیا اور کہا کہ 'حضرت! بارش نہیں ہو رہی ہے، کھیتی سوکھ جائے گی، کچھ تدبیر کیجیے۔' فرمایا 'اچھی بات

ہے، ابھی تدبیر کرتے ہیں۔‘ اور پھر کمرے میں چلے گئے اور نماز پڑھ کر دعا کی۔ دعا کے بعد باہر آئے اور فرمایا کہ ’دیکھو! بادل آرہا ہے؟‘ اس نے کہا ’نہیں آرہا ہے۔‘ پھر اندر گئے اور دعا کی اور باہر آکر پوچھا، پھر معلوم ہوا کہ بادل نہیں آرہا ہے۔ تیسری مرتبہ یہی عمل کیا اور پھر باہر آکر پوچھا تو اس نے بتایا کہ ’جی بادل آرہا ہے۔‘ ان کا اللہ پر اس درجہ اعتماد اور بھروسہ تھا۔ جب بارش نہیں ہوتی، دعا کردیتے، ہونے لگتی۔

یہ کیا تھا؟ رسول اللہ ﷺ کی دعا کی برکت تھی۔ ایسی مستجاب دعا تھی آپ کی۔ جس کے لیے جو کہہ دیا وہ ہمیشہ کے لیے ہوگیا۔

اس سے زیادہ حیرت انگیز بات بتاؤں۔ جب مکہ فتح ہوا تو آپ نے حکم دیا کہ خانہ کعبہ کی کنجی لاؤ۔ اس زمانہ میں جو کنجی بردار تھے، وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ حضرت علی کنجی لینے کے لیے گئے تھے۔ جب مانگا تو انھوں نے انکار کردیا۔ حضرت علی نے کہا کہ ’کیسے نہیں دوگے؟ حضور ﷺ مانگ رہے ہیں۔‘ کہا ’کوئی مانگ رہا ہو نہیں دیتا۔‘ بس حضرت علی کو بھی جوش آگیا اور زبردستی چابی چھین لی، اور لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچے۔ پیچھے پیچھے یہ بھی آئے۔ ان کو پورا یقین ہو چکا تھا کہ کنجی میرے ہاتھ سے گئی، اب واپس نہیں ملے گی۔ مگر اللہ نے آیت نازل فرمائی: اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰی اَھْلِھَا۔ [النساء:۵۸] اللہ تم لوگوں کو حکم دیتا ہے کہ امانت جس کی ہے، اس کو واپس کردی جائے۔ صحابہ چاہتے تھے کہ اب چابی ان کو نہ دی جائے، مگر اللہ کا حکم نازل ہو چکا تھا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے کنجی ان کو واپس کردی اور فرمایا کہ: خُذُوْہُ خَالِدَۃً تَالِدَۃً، لَایَنْزِعُھَا مِنْکُمْ اِلَّا الظَّالِمُ۔ [زرقانی: ج۲ص۳۳۹] یہ لو، ہمیشہ تمھارے پاس رہے گی، یہ کنجی تم سے وہی چھینے گا جو ظالم ہوگا۔ عرصہ ہوا یہ بات آپ نے فرمائی تھی، مگر اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ خاندان آج تک موجود ہے، اور چابی آج بھی اسی خاندان کے ہاتھ میں ہے۔ اس خاندان کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا، آج تک باقی ہے۔ ایک سے ایک سلاطین آئے، ملوک آئے، بادشاہ آئے، ایسے بھی آئے جو اپنے علاوہ کسی کو

دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتے تھے، مگر چابی وہیں رہی۔

یہ کلید بردار جن کا ذکر ہو رہا ہے ان کا نام عثمان بن طلحہ تھا، جس وقت یہ واقعہ پیش آیا تھا اُس وقت تو یہ مسلمان نہیں تھے مگر بعد میں اسلام قبول کرلیا تھا۔ ان کا تعلق خاندان بنوشیبہ سے تھا، اسی مناسبت کی وجہ سے ہر زمانہ میں کلید بردار کعبہ کو ''شَیبِـیُ'' کہا جاتا رہا ہے، اور آج بھی کہا جاتا ہے۔ خانہ کعبہ کا دروازہ کھولنے کے لیے شیبی صاحب ہی آئیں گے، چاہے وہ سعودی حکومت ہو یا ترکی حکومت۔ حضور ﷺ نے کہہ دیا 'خـالـدۃ طالدۃ'، یہ اسی کا اثر ہے۔

یہ کہہ رہا ہوں کہ وہاں یہ شان تھی کہ جو کہہ دیا قیامت تک کے لیے منظور ہو گیا۔ کسی کے لیے دولت کی دعا کردی تو بے پناہ ہوگئی۔ اپنے لیے مانگ لیے ہوتے تو کیا کمی ہوتی؟ کچھ نہیں۔ چاہتے تو ازواج کے لیے دعا کردیتے تو دولت کی بہتات ہو جاتی ہے، مگر یہ اللہ کی منشا کے خلاف تھا، اسی لیے ازواج کو دولت کی خواہش سے روکا نہیں، بلکہ اختیار دے دیا کہ دنیا و دارِ آخرت میں سے جو چاہو چن لو۔ تاریخ شاہد ہے، احادیث گواہ ہیں کہ ان میں سے کسی نے بھی آپ کو نہیں چھوڑا، سب نے آپ کے ساتھ ہی رہنا پسند کیا۔ یہ بھی انھیں کی تربیت کا اثر تھا کہ نگاہ اِدھر اُدھر نہیں بھٹکی، راہ راست پر ہی رہی۔

رسول اللہ ﷺ کی نگاہِ التفات کا اثر:

رسول اللہ ﷺ کی تربیت کا رنگ ہی دوسرا تھا۔ ایک صحابی ہیں حضرت ربیعہ اسلمی، یہ حضور ﷺ کی خدمت کے لیے ہمہ وقت مستعد رہا کرتے تھے۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ رات کو رسول اللہ ﷺ کے گھر کے پاس آکر بیٹھ جاتے تھے، تاکہ رات میں اگر کسی وقت آپ کو کوئی کام پیش آئے اور باہر نکلیں تو کسی کو تلاش نہ کرنا پڑے، میں ہی مل جاؤں اور مجھے کام کا حکم دیدیں۔ پوری رات اسی انتظار میں رہا کرتے تھے۔ جوانی تھی، طاقت تھی، جذبہ تھا، شوق تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے ایک کام کے لیے فرمایا، میں گیا، جلدی سے کر کے چلا آیا۔ آکر دیکھا تو آپ نماز میں تھے۔ سلام کے

بعد مجھے طلب کیا، میں اندر پہنچا تو آپ کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا، آپ بہت خوش ہوئے تھے مجھ سے۔ فرمایا کہ 'بتاؤ کچھ چاہتے ہو؟' حضرت ربیعہ کہتے ہیں کہ میں تو چکر میں پڑ گیا کہ 'کیا چاہوں؟ جو چاہوں گا، مل جائے گا۔' ایسے موقع سے آدمی کو پہلا خیال مال ہی کا آتا ہے، اور جب آدمی غریب ہو تو خاص طور سے آتا ہے۔ حضرت ربیعہ بھی غریب تھے، اس لیے ان کو بھی پہلا خیال مال ہی آیا، مگر انھوں نے جھٹک دیا کہ 'مال کا کیا کروں گا؟ یہ ختم ہونے والی چیز ہے، فانی ہے۔' آپ ﷺ ان کے جواب کے منتظر تھے۔

یہ بات مسلّم ہے کہ انسان کا جیسا حوصلہ ہوتا ہے، ویسی ہی چیز مانگتا ہے۔ حضرت ربیعہ حضور ﷺ کی خدمت میں ہیں اور آپ کی روشنی سے جگمگا رہے ہیں، آپ کی قلبی توجہات سے سرفراز ہو رہے ہیں، اسی لیے مال کا خیال آتے ہی فوراً نکل گیا۔

فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست:

اس پر مجھے اپنے گاؤں کا ایک قصہ یاد آ رہا ہے۔ گاؤں میں ایک اللہ والے تھے جو پانی پر چل رہے تھے۔ یہ ان کی کرامت تھی۔ ایک غیر مسلم ملاح نے ان کو پانی پر چلتے دیکھ لیا۔ ان بزرگ نے اس سے کہا کہ 'کسی کو یہ بات بتانا مت، اگر کچھ چاہیے تو بولو۔' وہ بے چارہ کیا تھا؟ اس کی ذہنی پرواز کتنی تھی؟ کہا تو یہ کہا کہ 'ایک گھڑا شراب دید یجیے۔' یہ وعدہ کر چکے تھے، مجبوری تھی، اس سے کہا کہ 'یہی پانی بھر لو۔' اس نے بھر لیا اور اس کے حق میں وہی ہو گیا جو اس نے چاہا تھا۔ اس کے بعد یہ کہا کہ 'میری زندگی میں کسی کو یہ بات بتانا مت، ورنہ ہانڈی پر پَرَئی [ڈھکن] نہیں بیٹھے گی۔ یعنی اگر بتا دیے تو تمھارے حالات اچھے نہیں رہیں گے۔ مگر جس کا حوصلہ شراب تک ہی محدود ہو، اس میں اتنی بڑی انہونی بات چھپانے کا حوصلہ کہاں سے آتا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے ضبط نہیں ہو سکا، پیٹ پھولنے لگا اور دو چار دن کے بعد لوگوں سے بتا دیا۔ انھوں نے کہا تھا کہ ہانڈی پر پَرَئی نہیں بیٹھے گی اور ایسا ہی ہوا۔ میں نے اس ملاح کو بڑھاپے میں دیکھا ہے، واقعی اس کے خاندان کے لوگوں نے اس کے بعد خوش حالی دیکھی ہی نہیں۔ اس کے بیٹے پوتے تھے، مگر اب

سب ختم ہوگئے ہیں، اس کا پورا خاندان مٹ چکا ہے۔

امام شافعی کے گھر ایک خاتون گئیں۔ امام صاحب کے یہاں نرینہ اولاد نہیں تھی، صرف بیٹیاں تھیں۔ ایک صاحبزادی نے امام صاحب کا مصلی دھوپ میں سوکھنے کے لیے ڈالا تو ان خاتون نے کہا کہ 'لگتا ہے کہ کسی بچے نے پیشاب کر دیا ہے۔' تو امام صاحب کی صاحبزادی نے کہا کہ 'یہاں کہاں بچہ؟ بات یہ ہے کہ رات میں والدِ بزرگوار سجدے میں اتنا روئے ہیں کہ مصلی بھیگ گیا ہے۔ یہ پیشاب نہیں آنسو ہیں۔' ظاہر ہے ان خاتون کی سوچ اتنی ہی تھی۔

آمدم برسر مطلب:

خیر! تو میں حضرت ربیعہ کی بات کر رہا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ دوسرا خیال یہ آیا کہ بادشاہت مانگ لوں، یہ مال سے بڑی چیز ہے۔ مگر پھر خیال آیا کہ بادشاہ تو فرعون اور نمرود بھی تھے۔ ان لوگوں نے کون سا تیر مار لیا؟ حضور ﷺ منتظر تھے کہ کچھ چاہے، کچھ بولے۔ پھر انھوں نے چاہا اور واقعی ایسا چاہا جو منشاے نبوت کے عین مطابق تھا۔ کہا کہ 'حضرت! جنت میں آپ کا ساتھ چاہتا ہوں۔' یہاں آپ کی خدمت کر رہا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ وہاں بھی آپ کی خدمت میں رہوں۔

یہ انھوں نے بہت بڑی چیز مانگ لی۔ کہاں نبی کا رتبہ اور کہاں امتی! حضور ﷺ ان کی بات سن کر تھوڑی دیر خاموش رہے، اس کے بعد فرمایا کہ: فَأَعِنِّي عَلٰى نَفْسِكَ بِكَثْرَةِ السُّجُودِ۔ [ابوداؤد: ۱۳۲۰] اچھی بات ہے، تم میری مدد کرو کثرتِ سجود سے، تاکہ تمھارے اندر اس کی استعداد پیدا ہوجائے کہ میری دعا تمھارے حق میں قبول ہوجائے۔'

رسول اللہ ﷺ کی صحبت اور تربیت کا اثر یہ ہوا کہ نہ مال کی اہمیت رہی، نہ بادشاہت کی خواہش رہی۔ سب سے بڑی سعادت یعنی جنت میں آپ کا ساتھ مانگ لیا۔ اسی تربیت اور صحبت کے رنگ نے ازواج مطہرات کے یہاں بھی اثر دکھایا، اور

سب نے باتفاق دنیا پر آخرت کو ترجیح دی، اور مال ومنال اور آرائش وزیبائش سے کنارہ کش ہو کر آپ کے ساتھ رہنا بخوشی پسند کیا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا۔ اگر تم نے اللہ کی اطاعت اور رسول کی فرماں برداری کی، اور اچھا عمل کیا تو ہم تم کو دہرا ثواب دیں گے۔ اور ہم نے عزت کی روزی تیار کر رکھی ہے۔ روزی دو طرح کی ہوتی ہے: ایک عزت کی روزی، جیسے مہمان کا رزق کہ یہ بہت معزز رزق ہوتا ہے کہ انتہائی عزت کے ساتھ کھلایا جاتا ہے۔ اور دوسری روزی وہ ہوتی ہے کہ آدمی دَر دَر کی ٹھوکریں کھاتا ہے تو کہیں جا کر دو لقمہ حاصل ہوتا ہے۔ جنت میں جنتیوں کو جو زرق ملے گا وہ مہمانوں والا ہوگا، یعنی معزز رزق ہوگا۔

پھر ازواج مطہرات کو ہدایت دیتے ہوئے فرماتے ہیں: يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ۔ اے نبی کی عورتو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تقویٰ اختیار کرو۔ ہمارے ذہن میں عام عورت نہ ہونے کا جو مطلب عام طور سے ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ تمھارا درجہ بہت اونچا ہے، تم ٹھاٹھ سے رہو۔ مگر یہاں یہ مطلب نہیں ہے بلکہ یہاں مطلب یہ ہے کہ تم کو نبی کے ساتھ زوجیت کا شرف حاصل ہے، اس لیے تم کو اور محتاط رہنا ہے۔ شریعت اسلامی کی پاس داری میں تم کو اور پکا ہونا ہے۔ دوسری عورتوں کی کچھ کمی کوتاہی گوارہ ہوسکتی ہے، مگر تمھاری گوارہ نہیں کی جائے گی۔ تمھاری زندگی نہایت محتاط ہونی چاہیے۔ نبی کے ساتھ رہنے کا تقاضا ہے کہ تمھاری دینی حالت میں کوئی کمزوری اور لچک نہیں ہونی چاہیے۔

پھر فرماتے ہیں: فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۔ تم نرمی کے ساتھ بات مت کرو کہ کوئی ایسا شخص جس کے دل میں روگ ہو، وہ لالچ کرنے لگے۔ اگرچہ اُم المومنین ہیں، تمام مومنین کی مائیں ہیں، مگر ماں ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ جیسے ماں سے پردہ نہیں، ویسے ہی ان سے بھی پردہ نہیں ہے۔ یہ

ماں کا درجہ شرف کے اعتبار سے ہے۔ چوں کہ ماں ہیں، اس لیے ان سے کسی کا نکاح نہیں ہوسکتا ہے۔مگر پردے کا مسئلہ جیسے عام عورتوں کے ساتھ ہے، ویسے ہی ان کے ساتھ بھی ہے، بلکہ ان کو خاص طور سے تاکید کی گئی ہے کہ: فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ ۔کسی سے بات کرنے میں بات میں کوئی لچک نہیں ہونی چاہیے۔ بلکہ غیر مردوں سے بات کرنے میں اندازِ گفتگو میں کرارا پن ہونا چاہیے، تاکہ کسی کے دل میں تمھاری طرف میلان نہ پیدا ہو۔ اگر تمھاری طرف کسی کا میلان ہوگیا تو یہ اس کے لیے ہلاکت کا باعث ہے اور تمھارے لیے بھی مصیبت ہے۔

وَقُلْنَ قَوْلًا مَعْرُوْفًا ۔اور معقول بات کہو، اچھی بات کہو، مگر لہجہ بہت نرم نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ لہجہ کی نرمی مرد کے دل میں وسوسہ پیدا کرسکتی ہے، اور لہجہ میں کرارا پن ہوگا تو کسی طرح کا کوئی میلان نہیں ہوگا۔

لہجہ کی نرمی خرابی کی بنیاد ہے:

یہ حکم صرف ازواجِ مطہرات کے لیے نہیں ہے، بلکہ تمام مومن عورت کے لیے ہے۔ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ عورت کے لہجہ کی نرمی مرد کا دماغ خراب کردیتی ہے۔ بالخصوص ان عورتوں کے لہجے کی لچک جو گھر میں رہتی ہیں، مگر ان سے پردہ کا حکم ہے، جیسے بھابھیاں اور سالیاں کہ ان سے پردے کا حکم ہے۔ان کے ساتھ بات چیت میں اندازِ گفتگو کی نرمی سے پہلے خیالات میں خرابی پیدا ہوتی ہے، اور پھر یہ خرابی اعمال کی خرابی تک پہنچ جاتی ہے۔اسی لیے اللہ نے حکم دیا ہے کہ غیر مرد سے بات کرنے میں کسی طرح کی لگاوٹ یا نرمی نہیں ہونی چاہیے۔اور یہ بھی نہیں کہ بے تکی ہانکتی رہو، بلکہ قولِ معروف کا حکم ہے۔یعنی جب بات کرنی ہو تو اچھی بات کرو۔ اِدھر اُدھر کی لغو باتیں آپس میں نہ کرو کہ یہ بھی فسادِ عمل کا باعث ہوسکتا ہے۔

عورتوں کے پردے کا مسئلہ:

اور پھر ہدایت دی جارہی ہے کہ: وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ ۔ اپنے گھر میں قرار

پکڑو، گھر ہی میں رہو۔عورتوں کے لیے اصل حکم یہی ہے کہ وہ باہر نہ نکلیں، گھر کی زینت بنی رہیں۔ ہاں یہ ہے کہ باہر نکلنا مطلقاً ممنوع نہیں ہے، بعض خاص خاص حالتوں میں نکلنے کی اجازت ہے، لیکن عمومی حکم یہی ہے کہ ان کا گھر میں رہنا متعین ہے۔

اب یہ مسئلہ اس زمانہ میں ہم لوگوں کے لیے سمجھانا خاصا مشکل ہوگیا ہے۔ جہاں اس مسئلہ کو چھیڑا کوئی نہ کوئی صاحب بول پڑیں گے کہ 'مولانا! آپ لوگ زمانہ سے واقف نہیں ہیں۔' ایک صاحب سے میں نے احتیاط کے لیے کہا تو انھوں نے کہا 'مولانا! آپ نہیں جانتے کہ اس زمانہ میں مسائل کیا کیا ہیں؟' میں نے کہا 'ہاں بھائی! ہم لوگ تو اس زمانہ میں رہتے نہیں، اس لیے کیا جانیں گے؟ مگر اتنا ضرور جانتے ہیں کہ یہ چیز پہلے فیشن بنی، پھر ضرورت ہوگئی، اور اب اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔' حدیث میں آتا ہے کہ 'عورت گھر سے باہر نکلتی ہے تو شیطان اسے گھات لگا کر دیکھتا ہے کہ میرا شکار آرہا ہے، اور پھر دوسروں کو متوجہ کرتا ہے۔' آئے دن مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

تعلیم نسواں مگر کیسے؟:

ہمارے زمانہ میں تو اس کے جواز کے لیے ایک خوب صورت نعرہ تعلیمِ نسواں کے نام سے ایجاد کیا گیا ہے۔ مجھے بھی تسلیم ہے کہ عورتوں کی تعلیم بہت ضروری ہے، عورتوں کو جاہل نہیں رکھا جائے گا۔ لیکن یہ بالکل تسلیم نہیں ہے کہ جتنی تعلیم مردوں کے لیے ضروری ہے، اتنی ہی عورتوں کے لیے بھی ضروری ہے۔ ہم نے نبی ﷺ کے یہاں نہیں دیکھا کہ جتنا مردوں کی تعلیم کا اہتمام ہے، اتنا عورتوں کے لیے بھی اہتمام ہو، نہ کمیت میں اور نہ کیفیت میں۔ اب تو لڑکیوں کی تعلیم کے لیے بہت سے مدارسِ نسواں سرگرم ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ کالج یا مدرسہ کے لیے عورتوں کو تعلیم کے نام پر گھر سے نکالنا غلط ہے۔ عورتوں کی تعلیم ہونی چاہیے اور بالکل ہونی چاہیے، مگر گھر پر ہی ہونی چاہیے۔ ہم کو دنیا داری نے اتنا گھیر لیا ہے کہ ہم کو فرصت نہیں کہ اپنے بچوں کو پڑھا سکیں۔ یہ فرصت اس لیے نہیں ہے کہ ہم کو دنیا کمانی ہے، ہم تو روپیہ کمانے کی مشین بن کر رہ گئے ہیں۔ بس

صرف پیسہ بنتا رہے، نہ اپنے بیٹے کی تعلیم کی فکر ہے اور نہ بیٹی کی۔ اب تو لوگوں نے آسان سا بہانہ تراش لیا ہے کہ ہم کو تو دکان سے فرصت نہیں، ملازمت سے فرصت نہیں ہے، لڑکی بے کار گھر میں بیٹھی ہے، اچھا ہے کہ اس کو کالج یا نسواں مدرسہ کے حوالے کر دیا جائے، وہاں جا کر پڑھتی رہے گی۔ درحقیقت یہ کام گھر والوں کا تھا، ماں باپ کا تھا۔ گھر میں رکھ کر، اپنی نگرانی میں رکھ کر، اپنی تربیت میں رکھ کر تعلیم دینی تھی۔ اور جتنی تعلیم گھر میں ہو جائے، وہی کافی ہے۔ باہر نکلنے کے بعد تو شیطان کی تیز نگاہ سے بچ نہیں سکتیں۔ وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ کا حکم ہر بالغ عورت کے لیے ہے کہ وہ گھر میں رہیں۔

تبرج جاہلیت کا مطلب:

آگے فرماتے ہیں کہ: وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى۔ اور زمانہ جاہلیت کا جو تبرج ہے، یعنی باہر گھومنا پھرنا، اس کو مت کرو۔ باہر نکلنا دو طرح سے ہوتا ہے: ایک یہ ہے کہ شرعی حجاب یعنی برقع یا قمیص میں سمٹی سمٹائی باہر نکلیں اور کام پورا کر کے واپس گھر آ جائیں۔ ایسا خیر القرون کے زمانے میں ہوتا تھا، ازواجِ مطہرات بھی اس طرح باہر نکلا کرتی تھیں۔ چنانچہ حضور ﷺ کی زندگی میں اور آپ کے بعد بھی ازواج حج کے لیے تشریف لے گئی ہیں۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے ازواج سے فرمایا تھا کہ 'اب تم لوگ گھر کو لازم کر لو۔' چنانچہ آپ کے اس حکم کے بعد بعض ازواج حج کے لیے بھی گھر سے باہر نہیں نکلیں کہ حج وعمرہ ہو گیا ہے، اب حضور ﷺ کا حکم پورا کرنا ہے۔

ہمارے زمانہ میں یہ جو رواج ہو گیا ہے کہ ہر عورت گھر سے باہر نکلتی ہے اور صرف باہر نہیں نکلتی ہے، بلکہ بن ٹھن کر نکلتی ہے۔ اگر کسی نے پردہ کا اہتمام کیا اور برقع پہنا تو وہ آج کل ایسا ہو گیا ہے کہ خواہ مخواہ لوگوں کی نگاہ اس کی طرف اٹھتی ہے۔ یہ تبرجِ جاہلیت نہیں تو اور کیا ہے؟ تعلیمِ نسواں کے طفیل میں لڑکیوں کا جھنڈ کا جھنڈ سڑکوں پر گھومتا نظر آتا ہے، اس کو تبرجِ جاہلیت نہیں کہیں گے تو کس کو کہیں گے؟

صبح یا شام کسی وقت سڑک پر نکل کر دیکھیے، عورتوں کی بے پرواہ قطار سڑک پر

چلتی نظر آتی ہے تو ہم جیسے لوگوں کی گردن سر جھکائے جھکائے دُکھنے لگتی ہے۔ مولانا عبدالغنی صاحب پھول پوری جب سڑک پر نکلتے تھے تو رومال چہرے پر ایسے ڈال کر نکلتے تھے کہ نہ ہم کسی کو دیکھیں اور نہ ہم کو کوئی دیکھے۔ کون روک سکتا ہے؟ کون ٹوک سکتا ہے؟ ایک وکیل صاحب سے میں نے اسی طرح کی بات کہہ دی تو گرم ہو گئے کہ آپ لوگ فالتو کی بات کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ’جانے دیجیے، چھوڑیے، مجھ پر گرم مت ہوئیے۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟ میں تو اللہ ورسول کی بات سنا رہا ہوں، اگر آپ کو پسند نہیں آرہی ہے تو نہ آئیے۔‘

وَاَقِمْنَ الصَّلَاۃَ وَآتِینَ الزَّکَاۃَ وَاَطِعْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہُ۔ **نماز قایم کرو، اللہ** نے جو مال تم کو دیا ہے اس میں سے زکوۃ دیتی رہو، اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، ان کی بات مانا کرو۔

اہل بیت کون ہیں؟:

اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ۔ **اللہ چاہتے ہیں کہ تم** سے گندی چیزیں ہٹا دیں اے اہل بیت!

ایک مستقل بحث یہ ہوتی رہتی ہے کہ اہل بیت کون ہیں؟ یہاں تو ازواج مطہرات کی بات ہو رہی، خاص طور سے ان کا نام لیا گیا ہے، ان کو مخاطب کیا جا رہا ہے، اس لیے یہاں اہلِ بیت متعین ہیں کہ ازواج مطہرات ہی ہیں۔ مگر جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی، اُس وقت آپ ﷺ اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ، حضرت حسن وحسین اور حضرت علی کو بلایا تھا اور ان پر چادر ڈال کر آپ نے کہا تھا کہ ’اے اللہ! یہ بھی میرے اہلِ بیت ہیں۔‘ اس لیے ان کو بھی اہلِ بیت میں شمار کیا جاتا ہے اور اس آیت کا مصداق مانا جاتا ہے۔ لیکن اس آیت کے سیاق سے اصل اہلِ بیت ازواج مطہرات ہی ہیں۔ ایک مستقل مسلک ہے جو ازواج کو اہل بیت میں نہیں مانتا، صرف حضرت فاطمہ، حضرات حسنین اور حضرت علی کو اہلِ بیت مانتا ہے۔ لیکن صحیح بات یہی ہے کہ اصل اہل بیت ازواج

ہی ہیں، حضرت فاطمہ اور حضرات حسنین اور حضرت علی حضور ﷺ کے قول: 'هٰـؤُلَاءِ أَهْـلُ بَيْتِيْ' کی وجہ سے اس میں شامل ہوگئے ہیں۔ بہرکیف ہمارا ماننا ہے کہ یہ بھی اہلِ بیت میں شامل ہیں اور وہ بھی شامل ہیں۔

وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا۔ اور تم کو خوب صاف ستھرا کردے۔ یعنی تم لوگ خوب ظاہری و باطنی پاکی کا اہتمام کرو۔ یہ حکم صرف ازواج کے لیے نہیں ہے، بلکہ ہر مسلمان عورت کے لیے ہے۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ ايَاتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ۔ اور یاد کرو اللہ کی ان آیات کو جو تمھارے گھروں میں پڑھی جاتی ہیں۔ یعنی انھی گھروں میں اللہ کے رسول ہوتے ہیں، اور وحی نازل ہوتی ہے، تو تم ان آیات کو یاد کرو، اور ان پر عمل کو حرزِ جان بنالو۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا۔ بے شک اللہ بھیدوں کو جاننے والے اور خبر رکھنے والے ہیں۔

عورتوں کے لیے حکم ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کریں، فرماں برداری کریں، اللہ کی آیتوں کو یاد کریں، قرآن پڑھیں، تو یہ ذمہ داری مردوں پر عاید ہوتی ہے کہ ان کو پڑھائیں۔ باپ ہے تو بیٹی کو، بھائی ہے تو بہن کو، شوہر ہے بیوی کو پڑھائے۔ یہ نہیں کہ ان کو آزاد چھوڑ دیں کہ جہاں چاہیں جا کر پڑھیں۔

آگے کی آیت میں اللہ نے ہر ایک کو یعنی مرد ہو یا عورت ہو، سب کو حکم میں برابر کا شریک قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں: اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِيْنَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِيْنَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِيْنَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِيْنَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصَّآئِمَاتِ وَالْحَافِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذّٰاكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَالذّٰاكِرَاتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَاَجْرًا عَظِيْمًا۔ بے شک فرماں بردار مرد ہوں یا فرماں بردار عورتیں، مومن مرد ہوں یا مومن عورتیں، عبادت گذار مرد ہوں یا

عبادت گذار عورتیں، سچے مرد ہوں یا سچی عورتیں، صابر مرد ہوں یا صابر عورتیں، دل سے جھکنے والے مرد ہوں یا دل سے جھکنے والی عورتیں، صدقہ کرنے والے مرد ہوں یا صدقہ کرنے والی عورتیں، روزہ دار مرد ہوں یا روزہ دار عورتیں، اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد ہوں یا حفاظت کرنے والی عورتیں، اور اللہ کا ذکر کثرت سے کرنے والے مرد ہوں یا ذکر کرنے والی عورتیں، ان سب کے لیے اللہ نے مغفرت اور شان دار اجر تیار کر رکھا ہے۔

یہ صفات مردوں کے اندر بھی ہونی چاہیے اور عورتوں کے اندر بھی ہونی چاہیے۔ جو شخص ان صفات کا مالک ہوگا، اللہ نے اس کے لیے مغفرت اور اجرِ عظیم کا انتظام کر رکھا ہے۔

اللہ تعالی ہم سب کو توفیق عطا فرمائیں۔

وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمین

❑❑❑

درسِ قرآن

[جامع مسجد شہر اعظم گڑھ]

حضرت زید اور حضرت زینب رضی اللہ عنہما کا نکاح اور نکاح کے ضمنی مباحث

الحمدلله رب العالمین والصلوة والسلام علی سید المرسلین وعلی آله وصحبه اجمعین۔

اَعُوۡذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطَانِ الرَّجِیۡم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

وَمَا کَانَ لِمُؤۡمِنٍ وَّلَا مُؤۡمِنَةٍ اِذَا قَضَی اللّٰہُ وَرَسُوۡلُہٗ اَمۡرًا اَنۡ یَّکُوۡنَ لَہُمُ الۡخِیَرَۃُ مِنۡ اَمۡرِہِمۡ وَمَنۡ یَّعۡصِ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیۡنًا﴿۳۶﴾ وَاِذۡ تَقُوۡلُ لِلَّذِیۡۤ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَاَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِ اَمۡسِکۡ عَلَیۡکَ زَوۡجَکَ وَاتَّقِ اللّٰہَ وَتُخۡفِیۡ فِیۡ نَفۡسِکَ مَا اللّٰہُ مُبۡدِیۡہِ وَتَخۡشَی النَّاسَ وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنۡ تَخۡشٰہُ فَلَمَّا قَضٰی زَیۡدٌ مِّنۡہَا وَطَرًا زَوَّجۡنٰکَہَا لِکَیۡ لَا یَکُوۡنَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ حَرَجٌ فِیۡۤ اَزۡوَاجِ اَدۡعِیَآئِہِمۡ اِذَا قَضَوۡا مِنۡہُنَّ وَطَرًا وَکَانَ اَمۡرُ اللّٰہِ مَفۡعُوۡلًا﴿۳۷﴾مَا کَانَ عَلَی النَّبِیِّ مِنۡ حَرَجٍ فِیۡمَا فَرَضَ اللّٰہُ لَہٗ سُنَّۃَ اللّٰہِ فِی الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلُ وَکَانَ اَمۡرُ اللّٰہِ قَدَرًا مَّقۡدُوۡرَا﴿۳۸﴾ الَّذِیۡنَ یُبَلِّغُوۡنَ رِسٰلٰتِ اللّٰہِ وَیَخۡشَوۡنَہٗ وَلَا یَخۡشَوۡنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ وَکَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیۡبًا﴿۳۹﴾[الاحزاب]

اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کے لیے اس بات کی گنجائش نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کے رسول کسی بات کا فیصلہ کردیں تو ان کے لیے اختیار رہو ان کے حکم سے۔ اور

جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے، وہ کھلی ہوئی گمراہی میں پڑا۔

اللہ اور رسول کا حکم اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہی ہے:

یہ ایک اصول ہے جو اللہ نے ارشاد فرمایا، اور یہ اصول ہر مومن کے لیے ہے خواہ وہ مرد یا عورت ہو۔ اور یہ قطعی اور حتمی اصول ہے۔ ایمان اور اسلام کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہم نے اپنے ارادے اور اپنی اطاعت کا دامن رسول کے ساتھ اور اللہ کے ساتھ باندھ رکھا ہے۔ اللہ اور رسول کا حکم اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہی ہے۔ اس لیے کہ جو اللہ کا حکم ہے، وہی رسول کا حکم ہے۔ اور رسول ﷺ اللہ کے حکم کی ترجمانی کرتے ہیں۔ تو جب کوئی حکم رسول اللہ ﷺ کی طرف سے صادر ہوگا تو اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کا حکم ہے، بلکہ وہ رسول ﷺ کا بھی حکم ہے اور اللہ کا حکم بھی ہے۔ اس لیے یہ بات قطعی طور سے ہر ایک مومن مرد اور عورت کو سن لینا چاہیے، سمجھ لینا چاہیے اور دل میں اسے مضبوط کر لینا چاہیے کہ جب اللہ کے رسول ﷺ کسی بات کا فیصلہ کریں تو پھر کسی مومن مرد و عورت کے لیے، کسی ایمان والے کے لیے اس سے روگردانی کی گنجائش بالکل نہیں ہے، اور نہ ہی ان کو کسی طرح کا اختیار رہے کہ چاہیں تو اس کام کو کریں اور چاہیں تو نہ کریں۔

رسول کی اطاعت دراصل اللہ کی اطاعت ہے:

جو اس حکم پر عمل کرے گا وہ اللہ اور رسول ﷺ کا فرمانبردار ہوگا، جس کے لیے اللہ نے یہ بشارت سنائی ہے: وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا۔ [الاحزاب: ۷۱] کامیابی، فلاح اور بامراد ہونا اسی کے لیے ہے جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے۔ اور اگر کسی نے نہیں مانا اور اطاعت نہیں کی تو وہ کامیاب اور بامراد ہونے سے بہت دور جا پڑا۔ تو رسول کی اطاعت فی الحقیقت اللہ کی اطاعت ہے۔ جب رسول کسی بات کا حکم دے دیں تو اس کا مطلب ہے کہ اللہ نے حکم دیا۔ اور اللہ کے حکم سے سرتابی کرنا کسی مومن مرد و عورت کا کام نہیں، یہ تو کافر کا کام ہے۔ کافر ہی ہوتا ہے جس کو

اس کی پرواہ نہیں ہے کہ اللہ کیا فرماتے ہیں؟ رسول کیا فرماتے ہیں؟ مومن کا یہ کام نہیں ہے۔

وَمَنْ يَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا۔ جواللہ اوراس کے رسول کی حکم عدولی کرتا ہے، نافرمانی کرتا ہے، وہ کھلی ہوئی گمراہی میں ہے۔

باپ اور بیٹے کا رشتہ زبان سے قایم نہیں ہوتا:

یہ آیت اپنے حکم کے اعتبار سے تو عام ہے لیکن ایک خاص موقع پر نازل ہوئی ہے۔اس کی وجہ سے اس آیت کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک آزاد کردہ غلام تھے زید ابن حارثہ۔آپ نے ان کو آزاد کردیا اور آزاد کرنے کے بعد یہ کرم فرمایا کہ ان کو بیٹا بنالیا۔ یہ منھ بولے بیٹے تھے۔اب بھی لوگ کسی کو اپنی اولاد بنالیتے ہیں، کسی کی اولاد نہیں ہوتی تو وہ کسی بچے کو گود لے لیتا ہے۔اولاد ہی جیسا اس کے ساتھ سلوک ہوتا ہے، پرورش ہوتی ہے، تربیت ہوتی ہے۔ اسلام کا حکم نازل ہوجانے کے بعد اس کی اتنی اہمیت باقی نہیں رہی۔ اس لیے کہ یہ قطعی حکم ہے۔ کیوں کہ محض زبان سے کہہ دینے سے کوئی بیٹا نہیں ہوجاتا۔ یہ وہ رشتہ نہیں جو زبان سے قائم ہو، زبان سے قائم ہونے والا رشتہ صرف زوجیت کا ہے، میاں بیوی کا رشتہ ہے۔ اس کے علاوہ کوئی رشتہ زبان سے قائم نہیں ہوتا۔ اگر کسی نے کسی کو اپنا بیٹا یا بیٹی بنالیا تو کہنے کے لیے تو ٹھیک ہے کہ وہ بیٹا ہے۔ اس کی پرورش، اس کی تعلیم وتربیت، اس کے ساتھ اچھا معاملہ سب ہورہا ہے، مگر شریعت اس کو بیٹا نہیں مانتی۔اس لیے اس کی نسبت اصل باپ سے ہٹا کر اُس آدمی کی طرف کرنا بھی صحیح نہیں ہوگا جس نے اسے بیٹا بنایا ہے۔ بلکہ ہمیشہ نسبت اُسی کی طرف جائے گی جو اس کا اصل باپ ہوگا۔اللہ تعالی نے حکم دیا ہے:ادْعُوهُمْ لِآبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۔ [الاحزاب: ۵]ان کو پکاروان کے باپ ہی کے نام سے، یہی اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف کی بات ہے۔

اس حکم کے نازل ہونے کے بعد مسلمانوں میں اس کا رواج باقی نہیں رہا۔

بیٹا بنانے کو تو بناتے ہیں لیکن سب جانتے ہیں کہ وہ وراثت نہیں پائے گا۔ اگر یہ شخص مر جائے گا تو یہ اس کا وارث نہیں ہوگا۔ ویسے محبت میں کسی کو اپنا بیٹا بنا لیا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اس کی ممانعت بھی نہیں ہے۔ ممانعت تو اس کی ہے کہ بیٹے اور بیٹی کے جو شرعی احکام وحقوق ہوتے ہیں، وہ اس پر نافذ کیے جائیں، یہ صحیح نہیں ہے۔ مگر دورِ جاہلیت میں اس کا بڑا اہتمام تھا، کسی نے اگر کسی کو بیٹا بنا لیا تو وہ بیٹا ہو گیا۔ اب اس کی بیوی اس پر حرام ہوگئی، یہ مر جائے گا تو اس کی وراثت اس کو ملے گی۔ اپنے سگے بیٹے کے ساتھ جو معاملہ ہوتا تھا، وہ سارا معاملہ اس کے ساتھ ہوتا۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ کا قصہ:

حضرت زید کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اپنا بیٹا بنایا تھا، وہ اس لیے نہیں بنایا تھا کہ آپ کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ آپ کی اولاد تو تھی لیکن ان کے ساتھ ایک خصوصی معاملہ ہوا تھا۔ وہ یہ کہ انھیں بچپن میں دشمنوں نے گھر سے اٹھا لیا تھا، اور مکہ لاکر بیچ دیا تھا۔ حضرت حکیم بن حزام نے جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے رشتہ دار تھے، خرید لیا تھا، اور حضرت خدیجہ کو ہدیہ کر دیا تھا۔ جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا آپ ﷺ سے نکاح ہوا تو حضرت زید حضور ﷺ کے پاس آ گئے۔ اُدھر اُن کے ماں باپ اپنے بچے کی یاد میں پریشان جہاں سراغ ملتا فوراً پہنچ جاتے۔ کچھ لوگوں نے ان کو بتایا کہ تمھارا بچہ مکہ میں نظر آیا ہے۔ ان کے والد تلاش کرتے ہوئے حضور ﷺ کے پاس آئے، اور کہا کہ 'یہ ہمارا بچہ ہے، اسے ڈاکوؤں نے اٹھا لیا تھا۔ آپ کا جو مال خرچ ہوا ہے، ہم دینے کے لیے تیار ہیں، آپ جس قدر مال چاہیں ہم سے لے لیں، مگر ہمارا بچہ ہمیں واپس کر دیں۔' آپ ﷺ نے فرمایا کہ 'مجھے آزاد کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اور مجھے تمھارے مال کی بھی ضرورت نہیں ہے، مگر آپ ذرا خود زید سے پوچھ لیں، وہ جانا چاہے تو شوق سے اسے لے جائیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب وحی کا نزول شروع نہیں ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے زید کو بلایا اور پوچھا کہ 'یہ تمھارے والد ہیں؟' انھوں نے اقرار کیا کہ 'ہاں'، آپ ﷺ نے

فرمایا کہ 'یہ تمھیں لینے آئے ہیں۔' باپ نے سمجھایا کہ تم میرے ساتھ چلو۔ حضرت زید بن حارثہ تھوڑی دیر سوچتے رہے، پھر بولے کہ 'میں انھیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ یہاں مجھے ماں باپ دونوں کی شفقت حاصل ہے۔' باپ پریشان کہ غلامی کی زندگی کو یہ پسند کرتا ہے۔ جب آپ ﷺ نے حضرت زید کا انکار اور نہ جانے پر اصرار دیکھا تو ان کے والد کے سامنے انھیں غلامی سے آزاد کردیا اور اپنا بیٹا بنالیا۔

بات یہ نہیں تھی کہ آپ کو اولاد نہ رہی ہو، بلکہ مسئلہ یہ تھا کہ ان کے گھر والوں کو اور خود حضرت زید کو رسول اللہ ﷺ نے ان کی اس محبت کے صلہ میں یہ انعام دیا اور اپنا بیٹا بنالیا جس کی وجہ سے ان کے گھر والے مطمئن ہوگئے۔ چوں کہ دور جاہلیت میں بیٹا بنالینا حقیقی بیٹے کی طرح ہوتا تھا، اس لیے ان کے گھر والوں کو اور زیادہ اطمینان ہوگیا۔

آیت کا پسِ منظر:

جب زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ غلامی سے آزاد ہوئے اور پھر حضور اکرم ﷺ نے ان کا نکاح کرنا چاہا تو نکاح کا پیغام ایک بڑے گھرانے میں دیا۔ یعنی اپنی حقیقی پھوپھی کی بیٹی سے۔ حضور ﷺ کی پھوپھی کی بیٹی تھیں حضرت زینب رضی اللہ عنہا، ان کے یہاں پیغام دیا کہ ان کا نکاح حضرت زینب سے کردیا جائے، حضرت زینب کے جو بھائی تھے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اور ان کے گھر کے لوگ سب مسلمان ہی تھے، ان لوگوں کو یہ بات گراں گزری کہ ہمارے گھر کی لڑکی کو ایک غلام کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ ان لوگوں نے معذرت کردی، منظور نہیں کیا یہ سوچ کر کہ حضور ﷺ کا پیغام ہی تو ہے کوئی حکم تو ہے نہیں۔ جب ان لوگوں نے معذرت کردی، تب اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ 'یہ رسول کا فیصلہ ہے، رسول نے جب ایک بات کا حکم دیدیا تو اب اس کی گنجائش نہیں کہ کوئی اس سے انکار کرے اور سرتابی کرے۔' یہ آیت جب نازل ہوئی تو حضرت عبداللہ بن جحش اور ان کے گھر کے باقی لوگ تیار ہوگئے اور کہا کہ اب معذرت کی گنجائش نہیں رہی، ہم تیار ہیں اور ان کا نکاح حضرت زینب سے کردیا۔

کفو ایک انتظامی مسئلہ ہے:

آج کل اور ہر زمانے میں کفو کا مسئلہ رہا ہے، اور کفو کا مسئلہ برحق ہے۔ کفو کا مسئلہ شرعی نہیں انتظامی مسئلہ ہے اور انتظام بھی شریعت میں مطلوب ہے۔ اس لیے اس اعتبار سے شرعی بھی کہا جا سکتا ہے۔ کفو کے معنی آتے ہیں جوڑ کا ہونا، برابر کا ہونا۔ ظاہر سی بات ہے کہ نکاح میں مرد و عورت کی زندگی ایک دوسرے کے ساتھ چلتی رہتی ہے۔ مرنے کے وقت تک دونوں میں مودت، دونوں میں تعلق، دونوں میں یکسانیت، دونوں میں ایک دوسرے کی قدردانی اگر نہ ہوگی تو گاڑی نہیں چل سکے گی۔ پھر اس کے نتائج بڑے خراب نکلتے ہیں، بڑی مصیبت کے نتائج نکلتے ہیں۔ اس لیے نکاح ایک ایسا انتظام ہے جو زندگی بھر کا ہے۔ یہ نہیں کہ نکاح کو کھیل بنا لیا، جب چاہا نکاح کر لیا اور ذرا بات بگڑی تو طلاق دیدیا۔

طلاق ایک انتہائی ناپسندیدہ عمل ہے:

طلاق دینا شریعت میں جائز ہے، لیکن ایسی مجبوری ہو جائے کہ: فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَنۡ لَّا یُقِیۡمَا حُدُوۡدَاللّٰہِ۔ [البقرہ:۲۲۹] اتنا ہو جائے کہ اب زوجین اللہ کے حقوق برقرار نہیں رکھ سکیں، شوہر و بیوی کے درمیان تعلقات میں اللہ کے جو احکامات ہوتے ہیں، ان کو یہ پورا نہ کر پائیں تو اس وقت طلاق دینے کی اجات ہوتی ہے۔ ورنہ عام طور سے طلاق دینے کی اجازت نہیں ہے۔ طلاق ایک ایسی جائز چیز ہے جو اللہ کو تمام جائز چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسند ہے۔ [ابوداؤد: ۲۱۷۷] اگر ہم اس کی مثال دیں تو کہہ سکتے ہیں کہ جیسے آدمی نے تھوک دیا اور پھر اپنے ہی تھوک کو چاٹے تو ناجائز اور حرام تو نہیں ہے، اس لیے کہ تھوک حرام چیز نہیں ہے، لیکن اس کا چاٹنا ابغض ہے، کوئی پسند نہیں کرے گا۔ معلوم یہ ہوا کہ بعض چیزیں اپنی اصل کے اعتبار سے جائز ہوتی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہوتی ہیں۔ ایسا ہی معاملہ طلاق کا بھی ہے۔ ایک عورت سے ایسا تعلق قائم ہو گیا کہ جس سے بڑھ کوئی تعلق نہیں ہو سکتا، پھر اس کو کاٹنا انتہائی ناپسندیدہ عمل

ہے۔

انسانی نفسیات سے متعلق ایک گہری حدیث:

حضور ﷺ کا ارشاد ہے: اَحۡبِبۡ حَبِیۡبَكَ هَوۡنًا مَا عَسٰی اَن یَّكُوۡنَ بَغِیۡضَكَ یَوۡمًا مَا۔ کہ محبت بھی کرو تو ذرا رک کر کرو، اعتدال کے ساتھ کرو۔ بہت زیادہ آگے مت بڑھو محبت میں۔ ہوسکتا ہے کبھی دشمنی ہو جائے۔ اور اسی طرح: وَاَبۡغِضۡ بَغِیۡضَكَ هَوۡنًا مَا عَسٰی اَن یَّكُوۡنَ حَبِیۡبَكَ یَوۡمًا مَا۔ [ترمذی: ۱۹۹۷] کسی سے اتنی دشمنی نہ کرو کہ کوئی تعلق ہی نہ باقی رہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک دن ایسا آئے کہ دونوں میں دوستی ہو جائے۔

اسی نوع کا ایک معاملہ ہمارے خاندان میں پیش آیا تھا۔ میں لڑکی کے باپ کو سمجھا رہا تھا کہ کچھ ایسا کیجیے کہ معاملہ بگڑنے نہ پائے۔ تو انھوں نے کہا 'مولانا صاحب! آپ کیا بات کرتے ہیں؟ اب میں قیامت تک اس آدمی کی چوکھٹ نہیں پھلانگ سکتا، اس کے گھر نہیں جاؤں گا۔' میں نے کہا کہ 'اتنی اونچی بول بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ نے بول تو دیا ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ آپ کو جانا پڑے۔' کہا 'نہیں کوئی سوال ہی نہیں ہوتا، قیامت تک میں اس کی طرف دیکھ نہیں سکتا۔' میں نے کہا 'ٹھیک ہے۔' پھر میں نے جا کر لڑکے کے باپ سے بات کی تو معاملہ طے ہو گیا، اس کی رخصتی ہو گئی، وہ اپنے شوہر کے پاس چلی گئی۔ اور دوسرے ہی دن یہ قیامت والے بھی آ گئے۔ اس وقت بہت شدت کے ساتھ یہ حدیث میرے ذہن میں آئی کہ اس میں انسانی نفسیات کی کتنی گہری بات کہی گئی ہے۔ آخر انسان کو ایسی بات بولنے کی ضرورت ہی کیا کہ معاملہ بالکل آخری حد تک پہنچ جائے۔

مولانا جمیل احمد صاحب جلال پور کے رہنے والے تھے۔ وہ ایک مرتبہ بتلا رہے تھے کہ میں نے ایک صاحب سے کہا کہ 'آپ بیٹھے ہی ہیں، چلیے عید کی نماز پڑھنے۔' کہا 'نہیں، فلاں عیدگاہ میں نہیں جاؤں گا، کہیں اور پڑھ لوں گا۔ اور جگہ بھی تو نماز ہوتی ہے۔' پوچھا کہ 'اس عیدگاہ میں کیوں نہیں جائیں گے؟' تو جواب ملا کہ 'وہاں فلاں مل جاتا ہے،

اور جہاں وہ جاتا ہے، وہاں میں نہیں جاؤں گا۔' میں نے کہا کہ 'ارے بھائی! وہ ایک کنارے رہے گا، آپ دوسرے کنارے چلے جایئے گا۔' انھوں نے کہا کہ' آپ ایک کنارے اور دوسرے کنارے کی بات کرتے ہیں، اگر وہ جنت میں جائے گا تو میں نہیں جاؤں گا۔' اب بھلا بتایئے! حد ہو گئی نا۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ اگر دشمنی ہو تو اس میں اعتدال کی راہ اختیار کرو، بہت زیادہ آگے نہ بڑھو۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ کل کو دوستی ہو جائے تو شرمندگی اٹھانی پڑے۔

یہ باہمی دوستی اور دشمنی کے بارے میں ارشاد ہے کہ اس میں اعتدال اختیار کرو، مگر بیوی سے دوستی کے بارے نہیں کہا گیا، وہاں تو جتنی محبت ہو، اچھا ہے۔ اور زوجین کی محبت اور تعلق کو بیان کرنے کے لیے اللہ نے ایک کو دوسرے کا لباس کہا ہے: هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ۔[البقرہ:۱۸۷] وہ تمھارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لباس ہو۔ جب اس درجہ کا تعلق ہو تو اس کو قطع کرنا کہاں سے پسندیدہ ہوگا؟ سوائے اس کے کہ کوئی بہت بڑی مجبوری پیش آجائے۔

طلاق دینے کا صحیح طریقہ:

اسی لیے ایک مجلس میں تین طلاق دینا یا ایک پاکی میں تین طلاق دینا جائز نہیں ہے۔ جائز نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ طلاق نہیں پڑے گی۔ طلاق اگر نہ پڑتی تو پھر ناجائز ہونے کے کیا معنی؟ کسی نے کسی کو تلوار ماری مگر اس کو لگی ہی نہیں تو اس تلوار مارنے کا حاصل کیا؟ اسی طرح اگر تین طلاق دی اور وہ واقع نہیں ہوئی تو اس کا کیا معنی، کیا حاصل؟ گناہ تو اسی وقت ہوگا جب عمل کا کچھ اثر ہو، اگر عمل کا کوئی اثر ہی نہ ہو تو پھر جائز ناجائز کی بحث ہی فضول ہے۔

بات آگئی تو بتادوں کہ دیکھیے! اس مسئلہ میں کتنی نزاکت ہے؟ تین طلاق بیوی کو دینا جائز ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ بہت مجبوری ہو تو ایک طلاق دے کر چھٹی کر دے۔ ایک طلاق دے کر اس کے قریب نہ جائے، اس کی عدت گذرے گی ایک حیض پھر دو حیض

پھر تین حیض اور پھر وہ بائن ہو جائے گی اور نکاح سے نکل جائے گی۔ جب تک عدت پوری نہیں ہوئی، تب تک وہ نکاح میں ہے، جب چاہے شوہر بغیر نکاح کے اس کو واپس لے سکتا ہے، نکاح وگواہ کی کوئی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ایک طلاق دینے کی صورت میں عدت کے دوران وہ بیوی ہی رہتی ہے اگر چہ وہ اس کو طلاق دے چکا ہے، مگر اس ایک طلاق کو جب چاہے ختم کر سکتا ہے۔اس کے برعکس تین طلاق دینے کے بعد اس کو واپس لینے کی گنجائش نہیں ہوتی، نہ نکاح سے نہ بغیر نکاح کے، وہ واپس آ ہی نہیں سکتی۔ جائز طلاق میں شریعت نے بہت سی پابندیاں لگا رکھی ہیں: عورتوں کے حیض اور ناپاکی کے ایام ہوتے ہیں، ان ایام میں طلاق دینا ممنوع ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں ایک طلاق دی تو رسول ﷺ نے انھیں حکم دیا کہ رجوع کرلو۔ یعنی اس طلاق کو ختم کر کے پھر سے اس کو اپنی بیوی بنا لو، یہ حیض کی حالت ہے، ناپاکی کے ایام ہیں، جب پاک ہو جائے گی پھر حیض آئے گا، پھر پاک ہوگی، تب طلاق دینا۔طلاق دینے کے لیے شریعت کا قانون اور حکم یہ ہے کہ پاکی کی حالت میں طلاق دی جائے، ناپاکی کی حالت میں طلاق نہ دی جائے۔ایک دوسرا حکم اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اُس پاکی میں طلاق دی جائے جس پاکی میں اس سے صحبت نہ کی گئی ہو۔ اگر پاکی کی حالت ہے، مگر صحبت کر چکا ہے تو طلاق نہ دے۔اس کے لیے اس حالت میں طلاق دینا صحیح نہیں ہے۔

اگر کسی وجہ سے تین طلاق دینا ضروری ہو جائے تو اس کی بھی گنجائش شریعت میں موجود ہے اور اس کا بھی ایک منظّم جائز طریقہ ہے۔ ہمارے یہاں تو ماشاء اللہ جب غصہ آتا ہے تو ایک ہی فائر میں تینوں گولی نکل جاتی ہے، بلکہ تین نہیں اَن گنت گولی نکلنے لگتی ہے۔شریعت اس کی اجازت دیتی ہے کہ ایک پاکی جس میں بیوی سے صحبت نہ کی ہو، ایک طلاق دے، تین طلاق دینا جائز نہیں ہے۔اب اس کے بعد پھر حیض آئے گا، پھر پاکی آئے گی، تو اس پاکی میں پھر ایک طلاق دیدے۔

فقہا سے ایک سوال:

یہاں فقہا سے سوال ہوتا ہے کہ ’جب ایک طلاق سے ضرورت پوری ہو رہی تھی تو دوسرے طہر میں پھر طلاق دینے کی کیا ضرورت؟ جب پہلی طلاق سے کام چل گیا تو دوسری یا تیسری طلاق کی کیا ضرورت ہے؟ یہ تو ضرورت سے زائد ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ مجبوری میں طلاق ہے، یہاں کون سی مجبوری ہے؟‘ تو فقہا اس کا جواب دیتے ہیں اور بہت عقل کی بات کہتے ہیں۔ آدمی نے جب حیض کے گزرنے اور پاکی کے آنے کا انتظار کرلیا اور اس کے بعد دوسری طلاق دے رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ غصہ میں طلاق نہیں دے رہا ہے۔ کیوں کہ اتنے دنوں میں تو غصہ ٹھنڈا ہو چکا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے سامنے اندرونی طور سے اتنی مجبوری ہے کہ اس مجبوری کی وجہ سے طلاق دے رہا ہے۔ طلاق دینے کی وجہ ہے، مگر وجہ ظاہر نہیں ہو رہی ہے۔ بیوی کے بہت سے ایسے تعلقات ہوتے ہیں جو سب کے سامنے ظاہر نہیں کیے جا سکتے۔ واقعی اس کو ضرورت ہے تب وہ طلاق دے رہا ہے۔ ورنہ پاکی کی حالت میں تو شوہر کو بیوی کی جانب رغبت ہوتی ہے کہ اس سے ملے، اس سے صحبت کرے، اس سے جنسی تعلقات قائم کرے، لیکن بجائے رغبت کے وہ اس حالت میں بھی طلاق دے رہا ہے تو معلوم ہوا کہ کوئی شدید ضرورت ہے، جو اس کو طلاق دینے پر مجبور کر رہی ہے۔

ظالم و مظلوم کا یک طرفہ فیصلہ:

طلاق بڑی مجبوری کی چیز ہے، یہ عام طور پر دینے کی چیز نہیں ہے۔ یہ زندگی بھر کا ساتھ یک لخت ختم کر دیتی ہے۔ نکاح کھیل نہیں ہے کہ جب چاہے نکاح کرلیا، جب چاہے طلاق دے دیا۔ اور اس کے بعد جب اس کے نتائج آتے ہیں، اولاد پیدا ہوتی ہے تب تو یہ اور بھیانک بن جاتی ہے اور مشکل چیز بن جاتی ہے۔ آج کل تو میڈیا وغیرہ نے طلاق وغیرہ کے مسئلہ کو ظلم قرار دے دیا ہے، یہ تو محض جذباتی نعرہ ہے جو غلط فہمی پر مبنی ہے۔ وہ یک قلم عورت کو مظلوم ثابت کرتے ہیں کہ طلاق دیدیا تو عورت مظلوم ہوگئی،

حالانکہ عورت مظلوم نہیں ہوتی۔ طلاق سے بس اتنا ہی ہوتا ہے کہ شوہر کا ہاتھ اس کے اوپر سے اٹھ جاتا ہے، مگر ماں، باپ کا ہاتھ اس پر باقی رہتا ہے۔ اس پر کوئی مظلومیت نہیں۔ آج کے معاشرہ نے اس کو مظلوم اور حقیر بنا رکھا ہے، اس لیے مظلوم نظر آ رہی ہے، ورنہ کون سی مظلومیت ہے؟ اور یہ بھی ایک اصول بنا رکھا ہے کہ جب بھی کوئی مسئلہ ہوگا عورت اور مرد کا تو عورت ہی مظلوم ہوگی مرد ظالم ہوگا۔ یہ ایک طرفہ فیصلہ کس قانون میں آ گیا ہے، کیا ظلم کا وجود عورتوں کی طرف سے نہیں ہوسکتا؟ کیا عورت اپنے شوہر کو نہیں ستاتی؟ سب ہوتا ہے، لیکن یہ کوئی ظلم نہیں ہے۔

عورت کی نصف وراثت کی حکمت:

جب ہم ابھی پڑھ کر فارغ ہوئے تھے، نئے نئے مولوی صاحب بنے تھے، بیس بائیس سال عمر تھی۔ ٹرین میں بیٹھے محمد آباد سے سرائے میر جا رہے تھے۔ ایک مولانا صاحب آ کر بغل میں بیٹھ گئے، اور مجھ سے کہنے لگے کہ 'مولانا صاحب! ایک مسئلہ ہے۔' میں نے کہا 'بھئی! ٹرین ہے، آواز ہے، کبھی اکیلے میں پوچھ لیجیے۔' کہا 'آپ لوگوں نے اسلام کو بس بیگ میں بند کر رکھا ہے۔' میرے پاس ایک بیگ تھا اسی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ 'اسلام کو ہر جگہ پھیلانا چاہیے۔' میں چپ ہو گیا کہ کون بوڑھے آدمی سے بحث کرے۔ لڑکا سا ایک شخص اور تھا، اس نے انھیں مولوی صاحب سے پوچھ دیا کہ 'مولوی صاحب! عورتوں کو وراثت میں آدھا حصہ کیوں ملتا ہے؟ آپ لوگوں کے یہاں عورت کمزور ہے تو اس کو آدھا حصہ دیتے ہیں، اور مردوں کو ڈبل دیتے ہیں۔ یہ کون سی بات ہے؟' ان مولوی صاحب کو آتا نہیں تھا خواہ مخواہ قابلیت دکھانے کے لیے چھیڑ رہے تھے۔ مجھ سے کہا 'آپ بتائیے۔' میں نے کہا 'آپ ہی بتائیے، مسئلہ آپ ہی نے چھیڑا ہے۔' وہ چپ ہو گئے، کچھ بولے نہیں، اگلا اسٹیشن سٹھیاؤں آیا، اتر کر چلے گئے۔ جب وہ چلے گئے تب اس شخص نے پھر مجھ سے کہا 'مولوی صاحب! آپ بتائیے۔' میں نے کہا ہاں اب بتاؤں گا۔ میں نے کہا دیکھیے! 'عورت کبھی بھی کسی بھی مرحلہ میں اکیلی نہیں، مرد اکیلا ہو

جاتا ہے، اکیلے کماتا ہے، خود کھاتا ہے، اپنے بیوی بچوں کو کھلاتا ہے۔مگر عورت کبھی اکیلی نہیں رہتی۔ میں نے کہا عورت کی زندگی میں کئی مرحلے آتے ہیں، کسی مرحلہ میں وہ بیٹی ہے،تو بیٹی کا خرچ باپ پر ہے،اور جب اس کی شادی ہوگئی تو پھراس کا خرچ شوہر پر ہے، اوراگرشوہرنہیں ہے، بیٹا بیٹی ہیں تو ان پراس کا خرچ ہے،اوراگر باپ، دادا، بیٹا، بیٹی، بھتیجا نہیں تو بھائی اس کا خرچ برداشت کریں گے۔شریعت نے سب پر تقسیم کردیا ہے کہ ایک عورت کا خرچ ان سب کو دینا ہے۔اگرشریعت پر عمل کریں گے تو عورت کبھی خرچ کی محتاج نہیں ہوگی۔ میں نے کہا کہ جب ایسا ہے کہ ہرمرحلہ میں اس کو مل رہا ہے،اس کی ساری ضرورت پوری ہورہی ہے تو وراثت دینے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ سب وراثت تو مردوں کو ملنی چاہیے،عورت کو کوئی ضرورت ہی نہیں ہے،لیکن یہ شریعت کی بڑی مہربانی ہے کہ عورت کو بھی آدھی میراث دے رہی ہے۔اس میں بڑی حکمتیں ہیں،ان حکمتوں کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔آپ یہ سمجھئے کہ اصولی اعتبار سے عورت کو میراث ملنی ہی نہیں چاہیے تھی،لیکن شریعت نے دیدی۔اب آپ بتایئے کہ اس میں کیا اعتراض ہے؟' تو اس نے کہا' مولوی صاحب! صحیح بات ہے۔' میں نے کہا' اورسن لیجیے کہ اگران لوگوں میں سے کوئی بھی نہ ہوتو تب بھی کوئی بات نہیں، اس لیے کہ ہماری حکومت پر ہے کہ اس کا وظیفہ دے اوراس کا خرچ چلائے۔اب وہ حکومت کی ذمہ داری میں آجائے گی۔مسلمانوں کی حکومت ہوگی تو اس کا خرچ بیت المال سے دیا جائے گا۔

تو عورت جب زندگی کے کسی مرحلہ میں تنہا نہیں ہوتی ہے تو جب عورت کو طلاق مل گئی تو کون سی مصیبت کھڑی ہوگئی؟ کیا اس کا خرچ گھٹ گیا؟ یہ تو آدمی دنیا کی محبت میں ڈوبا ہوا ہے، وہ چاہتا ہے کہ میرے ساتھ کوئی دوسرا شریک نہ ہو، ورنہ باپ ہے وہ خرچ دے، بیٹا ہے وہ خرچ دے۔اور یہ بھی نہیں کیا کہ ایک ہی آدمی خرچ دے،اگر باپ بھی ہے، بیٹا بھی ہے تو دونوں میں تقسیم ہوجائے گا۔ کچھ خرچ باپ دے گا، کچھ خرچ بیٹا دے گا۔ جب یہ انتظام ہے تو کب تنگی آئے گی۔ بہرحال میڈیا جو یہ کہتا ہے کہ طلاق

ظلم ہےتو وہ خود ہی ظالم ہے: وَمَن يَّتَعَدَّ حُدُوْدَاللّٰهِ فَاُوْلٰئِكَ هُمُ الظّٰالِمُوْنَ۔ [البقرہ:۲۲۹] جواللہ کے حدود سے تجاوز کرےتو وہی ظالم ہے۔

زوجین کے درمیان تفریق سے شیطان بہت خوش ہوتا ہے:

میں یہ عرض کرر ہا تھا کہ نکاح ایسی چیز ہے جس کو نبھانا ہے، شریعت نے اس کو نبھانے کا اہتمام کیا ہے۔ حضرت جابر سے مروی ایک حدیث ہے کہ 'شیطان پانی پر اپنا تخت بچھا کے جلوس کرتا ہے، اور اس کے جلوس میں اس کے تمام چیلے آتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ہم نے یہ کیا، یہ کیا، جس نے جو کیا ہوتا ہے، آ کے دہراتا ہے، اور شیطان ان کو شاباشی دیتا ہے کہ تم نے بہت اچھا کیا اور تم نے بھی بہت اچھا کیا۔ ایک شیطان آتا ہے اور کہتا ہے کہ' آج تو میں نے ایک میاں بیوی میں خوب جھگڑا کرایا، نوبت تفریق کی آ گئی۔' شیطان کا سردار اس کی بات سن کر بہت خوش ہوتا ہے اور اس کو شاباشی اور مبارک باد دیتا ہے۔ [مشکوۃ:۷۱] اور اس کی اس قدر تعریف کرتا ہے کہ دوسرے شیطان کو حسد ہونے لگتا کہ ہم لوگوں نے جو کام کیا اس پر کچھ نہیں، اور یہ میاں بیوی میں جھگڑا کرادیا تو بہت خوشی۔

ایام حج کا ایک حقیقی واقعہ:

ہمارے ایک بزرگ ہیں قاری ولی اللہ صاحب۔ وہ کہتے ہیں کہ عرفات کے میدان میں جیسے اللہ کی رحمتیں بہت آتی ہیں ایسے ہی شیطان بھی اپنا جلوس لے کے آتا ہے، اور جھگڑا کراتا ہے۔ ایک سال حج میں یہ واقعہ پیش آیا کہ منی میں بوڑھے میاں بیوی میں لڑائی ہوگئی، اور ایسی لڑائی ہوئی کہ عرفات جانے کے وقت بیوی کہتی ہے:'' چلا عرفات۔'' تو بوڑھا کہتا رہا'' تو جائیبا تو ہم نا جائب۔'' یعنی تم جاؤ گی تو ہم نہیں جائیں گے۔ چنانچہ بڑھیا چلی گئی اور یہ بیٹھے ہی رہ گیا۔ خیر وہاں بڑا عمدہ انتظام ہوتا ہے، پولیس وغیرہ اگر کسی کو دیکھ لیتی ہے تو کسی نہ کسی طریقہ سے عرفات پہنچا دیتی ہے۔ اس لیے کہ حج وہیں ہوتا ہے۔ مریض اگر مرتا ہوا ہوتا ہے تو ایمبولینس میں لے جاتے ہیں، عرفات میں

گزار دیتے ہیں، تاکہ اس کا حج ہو جائے۔ مگر معلوم نہیں یہ شخص کہاں پہ چھپا رہا کہ کسی نے دیکھا ہی نہیں۔ اس کے بعد ایک صاحب آئے، ہمارے دوستوں میں سے ہیں، ممبئی کے تھے، انھوں نے بہت کوشش کی صلح کرانے کی، مگر مکہ شریف میں صلح ہوئی نہیں، پھر مدینہ چلے گئے وہاں بھی صلح نہیں ہوئی۔ اب مدینہ سے ہم لوگوں کی روانگی تھی، بس پر بیٹھے تو ایک آدمی کم ہو رہا تھا، کہا 'بھئی! ایک آدمی کون کم ہو رہا ہے؟' تو بڑھیا کہتی ہے: ''ہمار بڑھؤ کم ہوئیں، او ہ نا ہیں آئی لن۔'' لوگ تلاش کرنے گئے، بڑی دیر کے بعد ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے ملے، ڈنڈا لے کر کہیں جا رہے تھے۔ لوگ پکڑ کر لائے اور بیٹھایا۔ جدہ میں جب ہوائی جہاز پر بیٹھ گئے تب صلح ہوئی۔

زوجین کے مابین مصالحت کی قرآنی تدبیر:

غرض اس پر شیطان بہت ہنستا ہے، یہ سب سے قریبی دوستی اور تعلق ہے، جب کوئی شیطان اس کو توڑ دیتا ہے تو اس کو ابلیس گلے لگا لیتا ہے کہ کام تو تمھارا ہے، باقی سب نے جو کیا ہے، ٹھیک کیا ہے، مگر اصل کام تو تمھارا ہے۔ اس حدیث سے اندازہ ہوتا ہے کہ میاں بیوی کے مابین تعلق اور محبت کتنی اہم چیز ہے، اس کو توڑ دینا، اس کو ختم کر دینا اللہ کے نزدیک کتنا ناپسندیدہ ہے۔ کوئی مجبوری ہو، اس کا ڈر ہو کہ اللہ کا حکم قائم نہیں ہو سکے گا تو اس کی تدبیر اللہ نے یہ بتلائی ہے کہ 'اگر ڈر ہو تو ایک حَکَم اِدھر سے بناؤ اور ایک حَکَم اُدھر سے بناؤ: اِن یُّرِیْدَا اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰہُ بَیْنَھُمَا ۔[النساء:۳۵] اگر ان دونوں کی نیت بخیر ہوگی اور اصلاح چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ موافقت پیدا فرما دیں گے۔

ہم نے اس کے تجربات کیے ہیں۔ غازی پور میں جب میں پڑھا رہا تھا تو وہاں محکمہ شرعیہ قائم تھا۔ اس میں ایک عورت کی طرف سے ایک مقدمہ دائر ہوا کہ 'ہم شوہر کے ساتھ نہیں رہیں گے، وہ پتا نہیں کیا کرتا ہے؟' اس مقدمہ میں ایک دو تاریخ پڑی۔ میں تھا نہیں، کہیں گیا ہوا تھا۔ جب واپس آیا تو تاریخ پڑی ہوئی تھی۔ میں نے کہا کہ 'فریقین کو بلا کر بات کی جائے تو ان شاء اللہ خیر ہوگا۔' دونوں فریق آ گئے۔ میں نے لڑکی سے کہا کہ

'تم یہ بتاؤ کہ کیا تم شوہر کے ساتھ رہنا چاہتی ہو؟' تو وہ رونے لگی۔ باپ بھی وہیں موجود تھا، وہ اس کے سامنے نہیں بول رہی تھی، اور اصل فتنہ اسی کا تھا۔ میں نے بہت دیر تک سمجھایا تو کہنے لگی کہ 'مولانا صاحب! ہم بالکل راضی ہیں، ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے، بس ابا نہیں چاہتے کہ ہم ان کے ساتھ رہیں۔' میں نے اس کے والد کو سمجھایا تو ان کی بھی سمجھ میں آ گیا۔ خوب روئے دھوئے معافی تلافی ہوئی۔ نوبت طلاق کی تھی، سمجھانے میں ایک ڈیڑھ گھنٹہ لگا، لیکن سب راضی ہو گئے۔ میں نے کہا 'اب یہیں سے لڑکی کو رخصت کر دیجیے، یہ شوہر کے گھر چلی جائے۔' باپ نے کہا 'مولانا صاحب! یہاں سے میرے گھر جانے دیجیے، یہ پرسوں آ جائیں اور لے جائیں۔' لڑکے نے کہا 'ٹھیک ہے۔' سارا مقدمہ ختم ہو گیا۔

کفو ایک انتظامی مسئلہ ہے، واجب یا فرض نہیں ہے:

آدمی اگر اصلاح چاہے تو اللہ تعالیٰ موافقت پیدا فرما دیتے ہیں۔ خیر یہ تفصیل نہیں بیان کرنی تھی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ نکاح کا مسئلہ بہت اہم ہے، اس لیے اس میں کفو کا اعتبار ہے۔ اگر کفو کا اعتبار نہ کیا جائے تو ہر دم لڑائی جھگڑا لگا رہے گا، اور ایک نہ ایک مسئلہ پیدا ہوتا رہے گا۔

ایک صاحب مجھ سے کہا کرتے تھے کہ جب غیر کفو میں نکاح ہو جاتا ہے تو جو اولاد پیدا ہوتی ہے تو پتا نہیں کیسی ہوتی ہے؟ اور صحیح ہے، اس لیے کہ کفاءت کا اہتمام شریعت میں ہے۔ رسول ﷺ نے حکم دیا ہے، مگر یہ ایسا شرعی مسئلہ نہیں ہے جس پر عمل واجب ہو، یہ ایک انتظامی مسئلہ ہے، اگر کہیں موافقت ہو سکتی ہے اور بظاہر کفو نہیں ہے تو شریعت اس نکاح کو ذرا بھی ناپسند نہیں کرتی ہے، بلکہ اگر مصلحت ہو تو غیر کفو میں نکاح کرنا بہتر ہوتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے حضرت زینب کا نکاح حضرت زید سے کیا، ایک تو اس لیے کہ لوگوں نے معاشرہ میں جو بڑے چھوٹے کی تفریق کر رکھی تھی، اسے ختم کیا جائے، اور

اس کے علاوہ دوسری اور بھی بہت سی مصلحت تھی۔ دونوں میں نکاح ہوگیا، مگر یہ نکاح نبھ نہیں سکا۔ حضرت زینب اور حضرت زید میں موافقت ہوئی نہیں، یہاں تک کہ حضرت زید گھبرا گئے۔ انھوں نے جا کر رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ یہ تو میرے ساتھ نہیں رہ پائیں گی، موافقت نہیں ہو پا رہی ہے۔ اس وقت آپ نے سمجھایا کہ اللہ سے ڈرو، خیال رکھو، اہتمام کرو: اَمۡسِكۡ عَلَيۡكَ زَوۡجَكَ ۔ عورت کو روک کر رکھو، طلاق مت دو۔ یہ آپ حکم نہیں دے رہے تھے، بلکہ ان کو سمجھا رہے تھے، لیکن جب کوئی صورت نباہ کی نہ ہوئی تو حضرت زید نے طلاق دی، اور حضور ﷺ کی اجازت سے طلاق یہ ہوئی تھی۔ یہاں حضور ﷺ نے غیر کفو میں نکاح کیا تھا اور مصلحتاً کیا تھا، مگر نباہ نہیں ہوسکا۔ اس نباہ نہ ہونے میں بہت سی مصلحتیں تھیں جو بعد میں ظاہر ہوتی رہیں۔ مگر عام مسئلہ یہی ہے کہ حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے کہ نکاح کفو میں ہو۔ اگر کسی کو کفو مل جائے تو جلدی سے نکاح کر دینا چاہیے۔ کل اگر وہ کفو ہاتھ سے نکل جائے اور دوسرا نہ ملے تو مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ چاہے مرد کا کفو عورت سے مل جائے یا عورت کا کفو مرد سے مل جائے۔

فرماتے ہیں کہ: وَاِذۡ تَقُوۡلُ لِلَّذِیۡۤ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ۔ اور جب تم کہہ رہے تھے اس شخص سے جس پر اللہ نے انعام فرمایا۔ حضرت زید پر اللہ نے انعام فرمایا تھا۔ اللہ کا انعام یہ تھا کہ ان کو اللہ نے اسلام کی توفیق دی، نبی کریم ﷺ کی صحبت میں رکھا، آپ کا صحابی بنایا، آپ کا چہیتا اور پیارا بنایا۔ وَاَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِ۔ اور تم نے اس پر احسان کیا۔ حضور ﷺ نے احسان یہ فرمایا کہ ان کو آزاد کیا اور مزید احسان یہ کیا کہ ان کو بیٹا بنالیا۔ ان سے کہا: اَمۡسِكۡ عَلَيۡكَ زَوۡجَكَ اس کو اپنے پاس روکو۔ وَاتَّقِ اللّٰهَ۔ اور اللہ سے ڈرو۔

وَتُخۡفِیۡ فِیۡ نَفۡسِكَ مَا اللّٰهُ مُبۡدِيۡهِ ۔ اور وہ بات تم اپنے جی میں چھپا رہے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا۔ آپ کو اس کا تکوینی طور سے اشارہ مل چکا تھا کہ زید طلاق دیں گے اور حضرت زینب آپ کے نکاح میں آئیں گی۔ مگر اب تشریعی بات یہ ہے، شریعت کا حکم یہ ہے کہ حتی الامکان طلاق نہ دی جائے۔ حضور اکرم ﷺ سوچ رہے

تھے کچھ نبھ جائے، جتنا نبھ جائے غنیمت ہے۔اسی لیے آپ نے اَمسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ کی تلقین کی۔

ایک سنگین غلطی کا ازالہ:

حضرت زید کے طلاق دینے کے سلسلے میں یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ لوگوں سے بیان کرنے والوں نے یہ بیان کر دیا کہ 'حضور ﷺ کی حضرت زید کے گھر حضرت زینب پر نگاہ پڑ گئی تو بے اختیار ان کی محبت رسول اللہ ﷺ کے دل میں آ گئی۔آپ نے دل میں سوچا کہ اگر زید طلاق دیدیں تو میں ان سے نکاح کر لوں۔اسی بات کو رسول اللہ ﷺ چھپا رہے تھے، مگر یہ دشمنوں کی پھیلائی ہوئی بات ہے۔یہ صحیح بات نہیں، بالکل غلط بات ہے۔حضرت زینب کو حضور نے پہلے بھی دیکھا تھا، اس لیے کہ وہ پھوپھی زاد بہن تھیں۔اور ظاہر بات ہے پھوپھی کے یہاں آنا جانا، تعلقات سب موجود تھے، اور پھر وہ لوگ مسلمان بھی تھے، اور پردہ کا حکم بھی ابھی نازل نہیں ہوا تھا۔اس لیے یہ کہنا کہ اس وقت حضور ﷺ نے دیکھا تھا اور آپ کے دل میں ان کی محبت آ گئی تھی، گویا کہ حضور ﷺ کا دل آپ کے اختیار میں نہیں تھا، بس جیسے ایک انسان کسی کو دیکھ لیتا ہے تو اس کے دل میں محبت آ جاتی ہے، ویسے ہی آپ کے ساتھ ہوا۔یہ بالکل غلط بات ہے، سو فیصد غلط بات ہے۔اسی لیے ایک بڑے مفسر علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ 'یہاں جن لوگوں نے اس طرح کی کچھ باتیں ذکر کر دی ہیں، وہ اس لائق نہیں کہ اس کا تذکرہ کیا جائے، لیکن کہیں کہیں کتاب میں لکھا ہے اور بہت سے جاہل بیان بھی کر دیتے ہیں۔اس لیے میں نے ذکر کر دیا کہ کہیں کوئی غلط فہمی میں نہ پڑ جائے۔ایسی کوئی بات نہیں ہے۔جو اللہ تعالی فرما رہے ہیں کہ 'آپ اپنے دل میں چھپا رہے تھے جس کو اللہ تعالی ظاہر کرنے والے تھے۔' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو علم ہو چکا تھا، اللہ کی طرف سے یہ بات پیغمبر کو معلوم ہو چکی تھی کہ حضرت زید طلاق دیں گے اور پھر وہ آپ کے نکاح میں آئیں گی۔لیکن اس بات کو آپ نے حضرت زید سے ظاہر نہیں کیا تھا اور یہ بھی نہیں کہا تھا

کہ تم طلاق مت دو، بس ان کو سمجھا رہے تھے، حالاں کہ آپ کو معلوم تھا کہ طلاق ہو جائے گی۔

دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَتَخۡشَی النَّاسَ ۔ اور لوگوں کا اندیشہ بھی محسوس کر رہے تھے۔ لوگوں کا اندیشہ کیا تھا؟ وہ یہ کہ جب زید اُن کو طلاق دیدیں گے اور وہ میرے نکاح میں آئیں گی تو بہت سی نامعقول باتوں کا لوگوں میں چرچا ہوگا۔ مثلاً یہ کہ نبی ہیں اور اپنی بہو سے نکاح کر لیا۔ مسلمانوں میں تو یہ بات طے ہو چکی تھی کہ یہ بہو نہیں ہیں، لیکن عام کفار اپنی پرانی روش پر ہی برقرار تھے۔

لوگوں کو بدگمانی سے بچانا بھی عملِ خیر ہے:

اگر بدگمانی کسی چیز سے پھیلتی ہو، اور وہ چیز لازم وواجب نہ ہو تو اسے ترک کر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ایک کام جائز ہے، درست ہے، واجب نہیں ہے، مگر اسے کرنے سے لوگوں میں بدگمانی پھیلنے کا اندیشہ ہے تو آدمی اس کام کو چھوڑ سکتا ہے، چاہے وہ کام اچھا ہی ہو۔ حضور ﷺ نے جب مکہ فتح کیا تو آپ خانہ کعبہ کو دیکھ رہے تھے، خانہ کعبہ کی تعمیر جدید آپ کی ابتدائی عمر میں ہوئی تھی۔ خانہ کعبہ کی جو پرانی عمارت تھی، اس میں آگ لگ گئی تھی، اس لیے اس کو گرا دیا گیا تھا، پھر نئی تعمیر ہوئی تھی۔ یہ تعمیر کفار نے کی تھی اور ان لوگوں نے اس میں ترمیم کر دی تھی۔ ایک ترمیم یہ تھی کہ خانہ کعبہ کی لمبائی کو چھ سات ہاتھ گھٹا دیا گیا تھا اور اب اس حصے کو حطیم کہتے ہیں۔ وہ اب بھی ہے۔ دوسری ترمیم یہ کی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کا جو دروازہ بنایا تھا، وہ دو تھا: ایک پورب کی طرف تھا اور ایک پچھّم کی طرف تھا۔ ان لوگوں نے یہ ترمیم کی کہ پچھّم والا دروازہ بند کر دیا اور پورب والا دروازہ باقی رکھا۔ تیسری ترمیم یہ کی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو خانہ کعبہ بنایا تھا، اس کا دروازہ زمین کے برابر تھا جیسے چوکھٹ لگی ہوتی ہے کہ آدمی بلا تکلف اس میں داخل ہو جائے۔ ایک طرف سے داخل ہو اور دوسری طرف سے نکل جائے۔ کفار نے یہ کیا کہ پچھّم کا دروازہ تو بند کر دیا اور پورب کے دروازہ کو قد آدم اونچا

کر دیا۔اب کوئی شخص جا ہی نہیں سکتا جب تک سیڑھی کا استعمال نہ کرے۔اور سیڑھی پر کفار کا اختیار تھا، جس کو چاہیں دیں اور جس کو چاہیں نہ دیں۔غرض ان لوگوں نے خانہ کعبہ پر اپنا حاکمانہ قبضہ اور اختیار برقرار رکھنے کے لیے اس کا دروازہ اونچا کر دیا تھا۔ حضور اکرم ﷺ دیکھ رہے تھے یہ خانہ کعبہ حضرت ابراہیم کی بنیاد پر نہیں ہے،اس میں خاصا تصرف ہوا ہے۔آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ’تمھاری قوم نئی نئی مسلمان ہوئی ہے، بدگمانی پھیلنے کا اندیشہ ہے، ورنہ میں خانہ کعبہ کو گرا کر پھر حضرت ابراہیم کی بنیاد پر اس کو بناتا: دونوں دروازوں کو نیچا کر دیتا اور حطیم کو کعبہ میں شامل کر دیتا۔‘ [بخاری:۱۵۸۶] یہ کام جائز تھا، اچھا کام تھا، لیکن یہ کوئی ایسا ضروری مسئلہ نہیں تھا کہ جس کی وجہ سے دینِ اسلام میں کوئی خلل پڑتا۔لہٰذا آپ نے باوجود اس کے کہ آپ کی خواہش تھی، نہیں کیا۔اس بنا پر کہ لوگوں میں بدگمانی پھیلے گی۔اس سے معلوم ہوا کہ لوگوں کو بدگمانی سے بچانا بھی ایک کام ہے، حتی الامکان ایسے کام سے بچنا چاہیے جس سے لوگوں میں بدگمانی ہو۔

ایک بہت مشہور محدث ابراہیم نخعی اعور تھے اور ان کے شاگرد سلیمان بن مہران اعمش تھے۔اعمش اس شخص کو کہتے ہیں جس کی آنکھ چُندھیائی ہوئی ہو۔دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ابراہیم نخعی نے اپنے شاگرد سے کہا کہ’مناسب یہ ہے کہ ہم دونوں الگ الگ راستے پر چلیں۔اس لیے جب ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں تو لوگ اعور اور اعمش کہہ کر ہم لوگوں کی غیبت کرتے ہیں اور گنہ گار ہوتے ہیں۔امت مسلمہ کو گناہوں سے سے بچاؤ۔‘تو اتنا اہتمام ہے کہ لوگوں کو بدگمانی اور بدکلامی سے بچایا جائے،کوئی ایسی حرکت نہ کی جائے جس حرکت سے لوگوں کو ہنسی آئے، بدگمانی ہو جائے۔

یہاں حضور ﷺ نے احتیاط کیا کہ خواہ مخواہ لوگ بدگمان ہوں گے۔ابھی مختلف قسم کی باتیں پھیلیں گی۔جیسے یہودیوں نے مدینہ میں کیا تھا کہ ابتدا میں حضور اکرم ﷺ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے، پھر خدا کے حکم سے قبلہ بدل دیا اور

خانہ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے لگے۔تو یہودیوں نے بدگمانی پھیلانی شروع کی کہ ان کا تو اعتبار ہی نہیں، کبھی ادھر رخ کرتے ہیں کبھی اُدھر کرتے ہیں۔ان کے اندر تو پختگی ہی نہیں ہے۔

بعد میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے...... جو حضرت عائشہ کے سگے بھانجے تھے...... اپنی خالہ سے سنا کہ حضور ﷺ نے ایسا کہا تھا تو جب ان کے اختیار میں کچھ دنوں کے لیے مکہ مکرمہ آیا تو انھوں خانہ کعبہ کو گرا کر پھر نئی تعمیر کی اور حطیم کو بھی اس میں شامل کرلیا۔اور دونوں دروازوں کو نیچا کر دیا۔ان کی شہادت کے بعد حجاج بن یوسف جو اس امت کا مشہور ظالم تھا، اس نے کہا کہ 'عبداللہ بن زبیر کی یہ عمارت نہیں رہے گی۔' پھر اس نے گرادیا اور پھر وہی کفار والی جو تعمیر تھی، اسی پر کر دیا۔حضرت عمر بن عبدالعزیز جب خلیفہ ہوئے تو ان سے کچھ لوگوں نے پھر سے نئی تعمیر کی بات کی، مگر اس زمانے کے علما نے کہا کہ 'نہیں حضرت! اب مت چھیڑیے، ورنہ کعبہ بادشاہوں کا کھلونا بن جائے گا۔' جب کوئی بادشاہ آئے گا تب وہ گرادے گا اور گرا کر پھر بنائے گا۔اس طرح یہ کھلونا بن کر رہ جائے گا۔جیسے آج کل کچھ لوگوں نے مسجد حرام میں کھیل کر رکھا ہے کہ جو بادشاہ آتا ہے وہ اپنے نام کا دروازہ بنواتا ہے اور توسیع کے نام پہ طرح طرح کے تماشے کرتا ہے۔

مفتی محمود صاحب [پاکستان] کی ذکاوت:

پاکستان کے مولانا مفتی محمود صاحب تھے، وہ سعودی کے عالم عبداللہ بن باز سے ملاقات کے لیے گئے۔تعارف ہوا کہ مولانا مفتی محمود صاحب ہیں پاکستان کے بڑے عالم ہیں، بہت بڑا ادارہ چلاتے ہیں۔ان کے ادارے کا نام 'قاسم العلوم' ہے۔بن باز نے پوچھا کہ قاسم العلوم میں یہ 'قاسم' کیسا ہے؟ انھوں نے بتلایا کہ ہمارے بڑے عالم اور بزرگ مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف نسبت ہے۔تو انھوں نے کہا کہ 'یہ تو شرک ہے، قاسم تو وہ نہیں ہیں، قاسم تو اللہ تعالی ہیں۔' مفتی صاحب بہت ذہین آدمی تھے، انھوں نے کہا کہ 'حضرت! اگر یہ شرک ہے تو اس طرح کا شرک بیت اللہ شریف میں

بھی میں دیکھ کر آیا ہوں۔' پوچھا کہ 'کیا؟' انھوں نے کہا کہ 'میں حرم شریف میں گیا تو لکھا ہوا تھا باب ملک عبدالعزیز۔ ملک عبدالعزیز کا یہاں کیا کام؟ یہ تو اللہ کا گھر ہے۔ یہ بھی تو شرک ہوا۔

حطیم کی تقسیم بھی ایک بڑی نعمت ہے:

خیر یہ الگ بات ہے۔ اگر کعبہ میں تعمیر نو کی اجازت دے دی جائے تو ہر بادشاہ اس میں کچھ نہ کچھ تصرف کرے گا۔ اجازت نہ ہونے میں بہت سی مصلحتیں ہیں۔ اب اس زمانہ کے اعتبار سے دیکھیے تو آدمی حج کرنے جاتا ہے، اتنی بھیڑ بھاڑ میں خانہ کعبہ میں داخل ہونا کسی کو کہاں نصیب ہوتا۔ مگر یہ ہے کہ اگر خانہ کعبہ میں داخل نہ ہو سکے تو حطیم میں ہو جائے۔ حطیم بھی خانہ کعبہ ہی کا حصہ ہے۔ خانہ کعبہ دیوار کا نام نہیں ہے، زمین اور اس کے محاذات کی فضا کا نام ہے۔ اب اگر کوئی شخص حطیم میں پہنچ گیا تو وہ خانہ کعبہ میں پہنچ گیا۔ اب اس طرح سے ان بے کسوں اور بے نواؤں کے لیے جن کے لیے کعبہ میں داخل ہونے اور اس کا ثواب حاصل کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی، ان کے لیے یہ گنجائش نکل گئی۔

بہر حال یہ مصلحت ہوتی ہے۔ کبھی کوئی ضروری چیز نہ ہو تو اس کو چھوڑ دیا جاتا ہے، لیکن اگر ضروری ہو تو اس کو نہیں چھوڑا جائے گا، چاہے لوگ کتنی ہی ملامت کرتے رہیں، لوگ کتنا برا بھلا کہیں۔ یہ حضور اکرم ﷺ کا بڑا احسان ہے کہ مصلحتوں کو بتا دیا۔

آمدم بر سر آیت:

خیر! حضور اکرم ﷺ کے دل میں یہ اندیشہ ہو رہا تھا کہ اگر نکاح کر لوں گا، اور نکاح کرنا ہی ہے تو تمام لوگوں میں بدگمانی پھیلے گی کہ اپنے بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا۔ اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: وَتُخْفِي فِيْ نَفْسِكَ۔ تم اپنے دل میں وہ بات چھپا رہے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ وَتَخْشَى النَّاسَ۔ اور لوگوں کا اندیشہ تم کو تھا۔ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَاهُ۔ اور اللہ زیادہ حق دار ہے کہ اس سے ڈرو۔ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ

مِنۡهَا۔ جب زید نے ان سے اپنی ضرورت پوری کر لی۔ یہ واحد صحابہ ہیں جن کا نام قرآن مجید میں آیا ہے، نبی نہیں ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کا نام لے کر قیامت تک لیے ان کے نام کی تلاوت کرادی۔ یہ بہت بڑی سعادت کی بات ہے۔اسی سے ان کی حیثیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ فَلَمَّا قَضٰی زَیۡدٌ مِنۡهَا وَطَرًا زَوَّجۡنٰکَهَا۔ جب زید نے ان سے ضرورت پوری کر لی تو ہم نے تمھارا نکاح ان سے کر دیا۔اسی لیے حضرت زینب اپنی سوکنوں سے کہا کرتی تھیں کہ تم لوگوں کا نکاح تو تمھارے گھر والوں نے پڑھایا ہے، میرا نکاح تو اللہ نے آسمان میں کیا ہے۔ زَوَّجۡنٰکَهَا کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے آسمان میں حکم دیا، اور ایسا ہی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

آگے فرماتے ہیں: لِکَیۡ لَا یَکُوۡنَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ حَرَجٌ فِیۡۤ اَزۡوَاجِ اَدۡعِیَآءِ هِمۡ۔ تاکہ اہل ایمان پر کوئی تنگی نہ رہے ان کے منھ بولے بیٹے کی بیویوں کے بارے میں۔ اِذَا قَضَوۡا مِنۡهُنَّ وَطَرًا۔ جب کہ وہ اپنی ضرورت پوری کر لیں۔ وَکَانَ اَمۡرُ اللّٰهِ مَفۡعُوۡلًا۔ اور اللہ کا حکم پورا ہو کر رہتا ہے۔ مَا کَانَ عَلَی النَّبِیِّ مِنۡ حَرَجٍ فِیۡمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ۔ نبی پر کچھ تنگی نہیں ہے اس چیز سے جو اللہ نے ان کے لیے مقرر کر دیا ہے۔یعنی آسانی ہی آسانی ہے۔ سُنَّةَ اللّٰهِ فِی الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلُ۔ یہ دستور رہا ہے اللہ کا ان لوگوں میں جو پہلے گذر چکے۔یعنی اور انبیا کے ساتھ بھی یہی دستور رہا ہے۔ وَکَانَ اَمۡرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقۡدُوۡرًا۔ اور اللہ کا امر مقرر کیا ہوا ہے۔ اَلَّذِیۡنَ یُبَلِّغُوۡنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وہ لوگ جو اللہ کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ وَیَخۡشَوۡنَهٗ اور وہ اللہ ہی سے ڈرتے ہیں۔ وَلَا یَخۡشَوۡنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ وَکَفٰی بِاللّٰهِ حَسِیۡبًا اور اللہ کافی ہیں حساب لینے والے۔یعنی اللہ حساب لینے کے لیے کافی ہیں۔

بہر حال پیغمبر کی شان یہ ہوتی ہے کہ ان کے دل میں کسی کا خوف نہیں ہوتا ہے، اللہ کا جو حکم ہوتا اس کو پورا کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح فہم عطا فرمائے۔

❑❑❑

درس قرآن

[جامع مسجد شہر اعظم گڑھ]

رسول اللہ ﷺ کا روحانی سلسلہ اور ختم نبوت

الحمدلله رب العالمین والصلوة والسلام علی سید المرسلین وعلی آله وصحبه اجمعین۔

اَعُوذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّیطَانِ الرَّجِیم

بِسمِ اللّٰهِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِنْ رِجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ وَکَانَ اللّٰهُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا﴿۴۰﴾یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوا اللّٰهَ ذِکْرًا کَثِیْرًا﴿۴۱﴾وَسَبِّحُوْهُ بُکْرَةً وَّاَصِیْلًا﴿۴۲﴾هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَمَلٰٓئِکَتُهٗ لِیُخْرِجَکُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَی النُّوْرِ وَکَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا﴿۴۳﴾

محمد تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، لیکن اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔ اور اللہ ہر چیز کو جاننے والے ہیں۔

یہ بات اسی سورت میں گزری ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک صحابی حضرت زید بن حارثہ کو اپنا منھ بولا بیٹا بنایا تھا، جس کو عربی میں 'متبنیٰ' کہتے ہیں اور اردو میں 'منھ بولا بیٹا' اور 'لے پالک' کہتے ہیں۔ عربوں میں اس کا دستور تھا کہ جس کو بیٹا کہہ دیا تو وہ بالکل نسلی بیٹے کی طرح ہو جاتا تھا۔ اس کے ساتھ وہ تمام معاملات جاری ہوتے تھے جو نسبی

بیٹے کے ساتھ ہوتے ہیں۔ وراثت میں وہ شریک ہوتا تھا، اس کی بیوی سے نکاح کرنا جائز نہیں ہوتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے جب ان کو بیٹا بنایا تو مکہ میں زید بن محمد ہی نام سے پکارے جانے لگے۔ اسی سورت میں اللہ نے اس حیثیت کو ختم کر دیا ہے اور فرمایا ہے کہ: اُدۡعُوۡهُمۡ لِاٰبَآئِهِمۡ هُوَ اَقۡسَطُ عِنۡدَ اللّٰهِ۔ [الاحزاب:۵] ان کو ان کے باپ کے نام ہی سے پکارو، یہ اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف کی بات ہے۔ اس کے بعد متبنّٰی بیٹے کی وہ حیثیت ختم ہو گئی جو زمانہ جاہلیت میں تھی۔

معاشرتی رسم کا ازالہ ایک مشکل عمل ہے:

چوں کہ یہ رسم بہت پرانی تھی، اس کی جڑیں بڑی گہری تھیں، اس لیے اس کی اصلاح ذرا مشکل کام تھا۔ اس کی اصلاح کے لیے اور اس کو ختم کرنے کے لیے صرف قول کافی نہیں تھا، بلکہ عمل کی بھی ضرورت تھی۔ اگر عملاً اس کی اصلاح نہ کی جاتی تو کمزور ضرور ہو جاتی مگر مکمل خاتمہ شاید نہ ہو پاتا۔ جیسے ہمارے ملک میں ایک زمانہ میں دستور تھا کہ عورتیں بیوہ ہو جاتیں تو ان کا دوسرا نکاح کرنا شرافت کے خلافت سمجھا تا تھا۔ شریف گھروں میں یہ بہت معیوب بات تھی۔ اس زمانہ کے کچھ بزرگوں نے اس کا اہتمام کیا کہ دوسرا نکاح کرنے کا رواج پیدا کیا جائے، تو ان کی بڑی مخالفت ہوئی، حالاں کہ وہ اسلام کا حکم سناتے تھے، دین کا حکم سناتے تھے۔ معاملہ یہ ہے کہ جب کوئی بھی رسم جڑ پکڑ لیتی ہے تو اس کے خلاف کوئی اٹھے، چاہے وہ کتنا ہی محترم کیوں نہ ہو، اس کے اوپر حملہ شروع ہو جاتا ہے۔

ہندوستان میں نکاحِ بیوگاں کا احیا:

نکاحِ بیوہ کے سلسلے میں ہمارے تین بزرگوں نے بڑی محنت کی ہے: ایک مولانا اسماعیل شہید صاحب، دوسرے مولانا قاسم نانوتوی صاحب اور تیسرے مولانا مظفر حسین صاحب۔ چوتھے ان حضرات کے سردار سید احمد شہید صاحب نے اس تحریک کی ابتدا کی تھی۔ مولانا اسماعیل شہید صاحب نکاحِ بیوہ پر جگہ جگہ تقریر کرتے، لوگوں سمجھاتے تھے۔

ان کی ایک بہن تھیں جو بوڑھی ہو چکی تھیں، اور بڑھاپے ہی میں بیوہ ہوئی تھیں، ان کا دوسرا نکاح نہیں ہوا تھا، اور ضرورت بھی نہیں تھی۔ مگر اعتراض کرنے والوں نے اعتراض کردیا کہ ’صاحب! آپ نکاحِ بیوہ پر تقریر کرتے ہیں اور آپ کی بیوہ بہن بیٹھی ہے، اس کا نکاح کیوں نہیں کرتے؟‘ حضرت نے یہ بات سنی تو فوراً اپنے گھر گئے، اپنی بہن سے بات کی کہ ’میں نکاحِ بیوہ پر تقریر کررہا تھا، اس پر یہ سوال ہوا ہے۔ آپ کہیں تو میں آپ کا نکاح کردوں، تاکہ یہ رسم ہمارے گھر سے عملاً ٹوٹ جائے، صرف بات ہی بات نہ رہے، بلکہ ایک عمل اور مثال بھی ہو جائے۔‘ انھوں نے کہا کہ ’میں بوڑھی ہو چکی ہوں، مجھے نکاح کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔‘ حضرت نے کہا کہ ’نہیں کرلیجیے، اگرچہ آپ کو نکاح کی ضرورت نہیں، مگر اس وقت معاشرہ سے اس بری رسم کو ختم کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ یہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہے، اس پر آپ کو اجر وثواب ملے گا۔‘ سمجھانے کے بعد وہ تیار ہو گئیں اور خاندان ہی کے بزرگ سے ان کا نکاح کردیا گیا۔

معاشرتی رسمیں جو جڑ پکڑ چکی ہوتی ہیں، ان سے صرف قول سے نہیں بلکہ عمل سے بھی لڑنا پڑتا ہے، بلکہ مصلح کو اس کی ابتدا اپنے گھر ہی سے کرنی پڑتی ہے، تاکہ لوگوں کے سامنے عمل کی ایک مثال قایم ہو، جسے دیکھ کر دوسرے لوگ بھی ہمت کریں۔

دین کی وضاحت میں طعنوں کی پرواہ نہیں ہونی چاہیے:

متبنّیٰ کی رسم کے خلاف جب قرآن کی آیت نازل ہوئی تو اس رسم کی جزیات جو اس وقت کے پورے عرب میں پھیلی ہوئی تھیں، یعنی وراثت اور ان کی بیویوں سے نکاح کا عدم جواز، یہ چیزیں ایسی تھیں جو آسانی سے ذہنوں سے محو نہیں ہونے والی نہیں تھیں۔ اس کی مخالفت عملاً ضروری تھی۔ اسی لیے حضرت زید کا نکاح پہلے حضرت زینب سے کیا گیا اور پھر طلاق کے بعد حضرت زینب کو حضور ﷺ کے نکاح میں دیا گیا۔ جب یہ سب ہوا، اس وقت کفار نے بہت طعنے دیے کہ اپنے بیٹے کی بیوی سے نکاح کرلیا، مگر یہ طعنے سہہ لیے گئے، اس لیے کہ ایک اہم مسئلہ کا بیان اور وضاحت ضروری تھی۔ حضور ﷺ

کی طرف سے اسی کی صفائی پیش کرتے ہوئے اللہ تعالی نے فرمایا ہے کہ: محمد مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔' یعنی ان کے سلب سے کوئی نرینہ اولاد اس وقت دنیا میں نہیں ہے۔ جوتھی یعنی حضرت طیب، حضرت قاسم اور حضرت طاہر تو یہ لوگ پہلے ہی اس دنیا سے جا چکے ہیں۔ تم لوگ جو سمجھتے ہو کہ زید کے باپ ہیں تو یہ تمھاری خام خیالی ہے، زید کے باپ حارثہ ہیں۔ لہذا زید کی مطلقہ بیوی ان کی بہو نہیں ہے کہ ان کے لیے حرام ہو۔

کوثر یعنی خیر کثیر:

کفار ایک طرف یہ کہتے تھے کہ زید آپ کے بیٹے ہیں اور دوسری طرف آپ کو اَبتر کا طعنہ بھی دیتے تھے۔ یعنی تمھاری کوئی نرینہ اولاد نہیں ہے، اس لیے تمھاری نسل چلنے والی نہیں ہے۔ اس پر اللہ تعالی نے سورہ کوثر نازل کی کہ 'یہ اگر سوچتے ہیں کہ تم ابتر ہو تو انتہائی غلط سوچتے ہیں۔ ہم نے تو تم کو کوثر عطا کیا ہے۔' کوثر کے معنی ہیں خیر کثیر۔ یعنی دنیا و آخرت کی ہر بھلائی جو انسان کے لیے مفید ہوسکتی ہے۔ کوئی بھی ایسی بھلائی نہیں ہے جو تمھیں نہ دی گئی ہو۔ ان ساری بھلائیوں کا مجموعہ ظاہری شکل میں قیامت کے دن اکٹھا حوضِ کوثر کی صورت میں ملے گا کہ انسان اگر اس کا پانی پی لے گا تو پھر کبھی اس کو پیاس نہیں لگے گی۔ اور وہ کوثر حضور ﷺ کے ہاتھوں تقسیم کیا جائے گا۔

دنیا کا کوثر یہ ہے کہ ہر خیر اور ہر بھلی چیز آپ کو عطا ہوئی ہے، اور آپ کے توسط سے اہلِ جہاں میں تقسیم ہوئی ہے۔ توحید سے بڑھ کر کیا خیر ہوسکتا ہے، اس سے بڑھ کر کون سی بھلی چیز ہوسکتی ہے۔ دنیا جس وقت توحید کو بھول چکی تھی، اس وقت توحید کی نعمت آپ کے ہاتھوں دنیا میں پھیلائی گئی، تقسیم کی گئی۔

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ۔[الکوثر: ۲] ان نعمتوں کے حاصل ہونے کے شکریے میں اپنے رب کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو۔ إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ[الکوثر: ۳] جو تمھیں برا کہتا ہے، جو تمھیں عیب لگاتا ہے، دراصل وہی ابتر ہے، اسی کی نسل نہیں چلے گی۔

کفار کے طعنے اور اللہ کی رحمتیں:

دنیا دیکھ رہی ہے کہ جن لوگوں نے حضور ﷺ پر عیب لگایا اور برا بھلا کہا، آج انھیں کی نسل موجود نہیں ہے، ختم ہو چکی ہے۔ یہ تو حضور ﷺ کا طفیل ہے کہ برائی ہی سے سہی آج ان کا نام لیا جا رہا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ ان کا نام بھلائی سے تو لیا نہیں جاتا، لیکن ان کا جتنا نام زندہ ہے، وہ صرف اس بنا پر ہے کہ حضور ﷺ کے ساتھ ایک نسبت لگی ہوئی، اگر چہ وہ نسبت مخالفت ہی کی ہے، عداوت ہی کی ہے، دشمنی ہی کی ہے، مگر ہے ایک نسبت، اس لیے ان کا نام بھی زبانوں پر آجاتا ہے۔ ورنہ کون جانتا کہ ابوجہل کون تھا؟ اور ابولہب کون تھا؟

دوسری طرف رسول اللہ ﷺ کے بعد ان کی روحانی نسل اور جسمانی نسل آج تک چل رہی ہے۔ جسمانی نسل حضرت فاطمہ سے چلی اور روحانی نسل کا تو پوچھنا ہی کیا۔ آپ کی پوری امت آپ کی اولاد ہے، امت کا ہر ہر فرد آپ کی اولاد ہے۔ نسبی اولاد تو نہیں، مگر روحانی اولاد ضرور ہیں۔ اور یہ قیامت تک سلسلہ چلتا رہے گا۔ اتنی زیادہ روحانی اولاد تو اور کسی کی نہیں ہوئی۔ اور یہ کفار کہتے ہیں کہ ابتر ہیں، ان کا سلسلہ نہیں چلے گا، ان کا نام نہیں چلے گا۔ کیوں نہیں چلے گا، ضرور چلے گا، اور ایسا چلے گا کہ دنیا حیرت کرے گی۔ اور نام صرف چلے گا ہی نہیں بلکہ دنیا کے سارے خیر کے ساتھ چلے گا۔ چنانچہ آج دنیا دیکھ رہی ہے کہ حضور ﷺ کا نام کہاں کہاں، کس کس عنوان سے اور کتنے احترام سے لیا جاتا ہے۔

رسول اپنی امت کا روحانی باپ ہوتا ہے:

آگے فرماتے ہیں: وَلٰـكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰـهِ ۔ لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں۔ اور رسول اپنی امت کا روحانی باپ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد ہے: اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ۔ [الاحزاب: ٦] نبی مومنین سے ان کی جان سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ یعنی مومن اپنی جان پر اتنا مہربان اور شفیق نہیں ہے جتنا آپ ﷺ

ہر مومن پر مہربانی وشفقت فرماتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ یہ شفقت صرف انھیں تک محدود تھی جو آپ کے زمانہ میں تھے، بلکہ یہ شفقت قیامت تک آنے والے تمام مومنین کے حق میں ہے۔

حضرت معاذ بن جبل حضور ﷺ کے خاص صحابی تھے، آپ نے ان کو اپنی زندگی ہی میں یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تھا۔ جب یہ روانہ ہو رہے تھے تو حضور ﷺ بنفس نفیس ان کو رخصت کرنے کے لیے دور تک ان کے ساتھ تشریف لے گئے تھے۔ چوں کہ وہ قاضی بنا کر بھیجے جا رہے تھے، اس لیے رسول اللہ ﷺ ان کو قضا کے اصول وغیرہ بتا رہے اور ان سے مختلف سوالات ان کی سمجھ داری کا امتحان لینے کے لیے کر رہے تھے۔ آخر میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ 'معاذ! تم یمن جا رہے ہو، ہوسکتا ہے کہ جب تم واپس لوٹو تو مجھے اِس جگہ نہ پاؤ۔' حضرت معاذ نے یہ سنا تو تڑپ گئے۔ صحابہ کرام کو سب کچھ گوارا تھا مگر آپ کے نہ ہونے کا تصور ان کے لیے از حد مشکل تھا۔ حضرت معاذ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، رسول اللہ ﷺ کی آنکھ بھی نم ہوگئی۔ آپ نے چہرہ دوسری طرف کرلیا اور فرمایا کہ 'جاؤ اے معاذ! مجھ سے قریب ترین وہ شخص ہے جو متقی ہے، چاہے جہاں ہو، اور چاہے جب ہو۔'

تو میں یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ سے قربت اور آپ کی شفقت کی ڈور زمان ومکان میں منحصر نہیں ہے، بلکہ یہ قیامت تک آنے والے لوگوں کو محیط ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر ایک کو جو ایمان ملا ہوا ہے، وہ انھیں کی بدولت ملا ہے۔ باپ کسے کہتے ہیں؟ جس کا خون بیٹوں کی رگوں میں دوڑ رہا ہو۔ کون ایسا شخص ہے جو مومن ہو اور اس کا ایمان آپ کے واسطے سے نہ ہو؟ جس کے دل میں بھی ایمان ہے، سب کا ایمان انھیں کے قلب سے مستفیض ہے۔ یعنی وہی ایمان سب کے دل میں پایا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو حضور ﷺ ایمانی طور پر تمام مومن کے باپ ہیں۔ اور یہ ایمانی باپ ہونا ایسا ہے کہ مسلسل رسول اللہ ﷺ سے تعلق قایم ہے۔ اگر اس تعلق میں ذرا بھی فرق پڑ جائے تو

ایمان ہی ختم ہوجائے گا۔اور جب ایمان ختم ہوجائے گا تو یہ بیٹا بھی نہیں رہے گا۔اس لیے یہ اتصال دایماً ہونا چاہیے،آپ ﷺ چاہے جہاں ہوں، زمین کے اوپر ہوں یا زمین کے نیچے ہوں۔

آپ زمین کے نیچے قبر اطہر میں تشریف رکھتے ہیں تو آپ وہاں بھی زندہ ہیں۔ آپ وہاں بھی امت کے لیے دعائیں کرتے ہیں،کوئی آپ کو سلام کرتا ہے تو سلام کا جواب دیتے ہیں ،درود پڑھا جاتا ہے تو وہ درود آپ تک پہنچایا جاتا ہے۔وہاں سے مسلسل رابطہ قایم ہے، اور اسی رابطہ کی وجہ سے انسان کے دل میں ایمان قایم ہے۔ رابطہ کٹ جائے، تعلق ختم ہوجائے تو ایمان ہی ختم ہوجائے۔اس لیے کہ آپ روحانی باپ ہیں، اللہ کے رسول ہیں، اللہ کے قاصد ہیں، اللہ اور بندے کے درمیان آپ واسطہ ہیں۔بندے آپ کے بغیر اللہ کی رضا تک، اللہ کے حکم تک نہیں پہنچ سکتے ہیں۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلَی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِہِمْ وَاَزْوَاجُہُ اُمَّھَاتُھُمْ۔ [الاحزاب: ٦]

اس آیت کے بارے میں کسی کو یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ ’اس میں تو رسول اللہ ﷺ کے لیے باپ کا لفظ استعمال نہیں ہوا ہے،صرف ازواج کے بارے میں صراحت ہے کہ وہ مومنین کی مائیں ہیں۔‘اس شبہ کا آسان سا جواب ہے کہ ’ازواجِ مطہرات ماں ہیں،تو کیسی ماں ہیں؟ ظاہر سی بات ہے کہ نسبی ماں تو ہیں نہیں،تو پھر یقیناً روحانی ماں ہیں۔تو جب ان کے روحانی ماں ہونے کی صراحت ہوگئی تو اس سے خود بخود آپ ﷺ کا روحانی باپ ہونا ثابت ہوگیا۔‘

آگے فرمایا: وَخَاتَمَ النَّبِیِّیْنَ ۔اور نبیوں کے خاتم ہیں، سب سے اخیر میں آنے والے ہیں۔اب آپ کے بعد کوئی دوسرا نبی نہیں آنے والا۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ: أَنَا خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ ۔[ترمذی:۲۲۱۹] میں خاتم النبیین ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں آ سکتا۔

نبوت کا چور:

یہ الگ بات ہے کہ آپ کے بعد بہت سے بد بختوں نے نبوت کا دعوا کیا،مگر

سب اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں۔ چنانچہ آپ کی حیات ہی میں نبوت کے چور آنے شروع ہو گئے تھے۔ مسیلمہ کذاب جس نے نبوت کا دعوا آپ کی حیات ہی میں کیا تھا، وہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ 'میں آپ پر ایمان لاؤں گا، مگر میری ایک شرط ہے۔' اس طرح کے بہت سے لوگ آپ کے پاس آتے تھے، ایمان قبول کرنے کے لیے کچھ شرطیں رکھا کرتے تھے۔ آپ ان کی شرطیں سنتے اور اگر قابلِ قبول ہوتیں، قبول کر لیتے، ورنہ رد کر دیتے۔ بنوثقیف کے لوگ ایک مرتبہ آپ کے پاس آئے اور کہا کہ 'ہم ایمان قبول کرنے کے لیے تیار ہیں، مگر ہماری کچھ شرطیں ہے۔' آپ نے پوچھا کہ 'کیا شرطیں ہیں؟' تو انھوں نے دیگر شرطوں کے ساتھ یہ بھی ایک شرط رکھی کہ 'ہم نماز نہیں پڑھیں گے، نماز سے ہماری چھٹی کر دیجیے۔' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ 'اس دین میں کوئی خیر نہیں جس میں نماز نہیں۔' [ابوداوٗد:۳۰۲۶]

تو مسیلمہ نے بھی کہا کہ میری ایک شرط ہے۔ آپ نے پوچھا کہ 'کیا ہے؟' کہا 'جب آپ دنیا سے جائیں تو مجھے اپنا خلیفہ بنا کر جائیں۔' سبحان اللہ! ابھی مسلمان ہوئے نہیں اور خلافت کا خواب دیکھنے لگے۔ حضور ﷺ نے فرمایا...... اس وقت آپ کے ہاتھ میں کھجور کی چھڑی تھی...... 'خلافت تو دور کی بات ہے، اگر تم کہو کہ اس کھجور کی شاخ کے دو ٹکڑے کر کے ایک ٹکڑا مجھے دیدیجیے، تو میں نہیں دوں گا۔' [بخاری:۴۳۷۸] اگر تم کو ایمان لانا ہے تو لاؤ اور نہ لانا ہو تو مت لاؤ۔

جھوٹ زیادہ دن نہیں چلتا اور سچائی چھپی نہیں رہ سکتی:

یہ سن کر وہ بگڑ گیا اور آپ کے پاس سے اٹھ کر چلا گیا اور جا کر ایوانِ نبوت میں ڈاکہ زنی شروع کی۔ اس وقت جب مسیلمہ نے نبوت کا جھوٹا دعوا کیا تھا، اس وقت اَور گیارہ بدبختوں نے نبوت کا دعوا کر رکھا تھا، جس میں ایک عورت بھی تھی۔ مگر ان سب جھوٹے دعویداروں کا اللہ نے انتظام کر رکھا ہے۔ جو جھوٹی نبوت کا دعوا کرتا ہے ختم ہو جاتا ہے، فنا ہو جاتا ہے۔ اللہ کا یہ بھی ایک قانون ہے کہ کبھی کسی کا جھوٹ چھپا نہیں رہ سکتا۔ ایسا

نہیں ہوسکتا کہ کوئی جھوٹ بولے اوراس کی پول نہ کھلے۔اورایسا بھی نہیں ہوسکتا کہ کوئی سچا ہواوراس کی سچائی چھپی رہ جائے۔رسول اللہ ﷺ سچے نبی تھےتو آپ کی سچائی جوں جوں قیامت قریب آتی جاتی ہے،اتنی ہی روشن ہوتی جاتی ہے۔جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے آپ کی صداقت نکھرتی جاتی ہے۔

بدبخت ہے وہ انسان ......:

بعثت کے بعد آپ پر بہت سے بے بنیاد الزام لگائے گئے،کسی نے پاگل کہہ دیا،کسی نے شاعر کہہ دیا،کسی نے کہا کہ جن لگ گیا ہے،مگر کوئی شخص اس وقت بھی اور آج بھی یہ نہیں کہہ سکا کہ فلاں موقع سے آپ جھوٹ بولے تھے،خلافِ واقعہ بات کہی تھی، ایسا کوئی واقعہ نہیں ہے۔آپ نے کوئی بات ماضی کی کہی ہو یا مستقبل کی کہی ہو،ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی نے الزام دیا ہو کہ آپ نے یہ پیشین گوئی کی تھی،مگر ایسا ہوا نہیں۔اس کا یقین صرف مسلمان کو نہیں کفار کو بھی تھا۔

میں نے سنایا تھا کہ ابی بن خلف آپ کا جانی دشمن تھا،اس نے گھوڑا پال رکھا تھا اور ایک ہتھیار بنا رکھا تھا اور کہتا تھا کہ میں اسی سے تم کو قتل کروں گا۔آپ نے فرمایا کہ 'نہیں، میں تم کو قتل کروں گا۔' یہ مکہ کی بات ہے۔مدینہ طیبہ ہجرت کے بعد جب دوسری جنگ ہوئی اوراس میں مسلمانوں کی شکست کے آثار ظاہر ہوئے تواس وقت حضور ﷺ بھی میدان میں موجود تھے۔اس نے دیکھ لیا اور گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا،جب قریب پہنچا تو آپ کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ہتھیار تھا،اس سے مارا تو وہ خراشتا ہوا گردن کے پاس سے نکل گیا۔اس کے بعداس کا حال یہ ہوا کہ وہ چلاتا ہوا پلٹا،اس قدر زور سے چیخ رہا تھا جیسے بیل چلا رہا ہو۔اس کو اتنی تکلیف اور اتنی پریشانی تھی اس چھوٹی سی خراش سے۔ابوسفیان نے کہا کہ 'کیا ذرا سی خراش آگئی ہے تو اتنا چلا رہے ہو؟ اتنے بہادر ہوکر یہ کیا بزدلی کررہے ہو؟' اس نے کہا کہ تم جانتے نہیں کہ 'کس نے خراش لگائی ہے،اس شخص نے خراش لگائی ہے کہ اگر مجھ پر تھوک بھی دیتا تو میں مرجاتا۔' اس کو بھی اتنا یقین تھا کہ جو کہہ

دیا وہ ہوگا۔ یہ اکیلا بد بخت ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے مارا ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ ’سب سے بد بخت انسان وہ ہے جس کو کوئی نبی قتل کرے یا جو کسی نبی کو قتل کرے۔‘ نبی بلا شبہ بہت بہادر ہوتے ہیں، مگر اس کے ساتھ بہت رحیم، شفیق اور شریف ہوتے ہیں۔ حضور ﷺ ہمیشہ جنگ میں آگے رہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جنگ میں جو شخص آپ کے ٹھیک پیچھے ہوتا تھا، وہ بہت بہادر سمجھا جاتا تھا، مگر تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی کو اپنے ہاتھ سے مارا ہو یا قتل کیا ہو۔ آپ کی رحمۃ للعالمینیت سب کے ساتھ تھی۔ یہی واحد بد بخت تھا جس کو رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں سے ہلکی سی خراش لگی اور وہ اس سے تباہ ہو گیا، ختم ہو گیا۔

آپ کے یہاں کوئی ایسی بات نہیں جس کے بارے میں کہا جا سکے کہ محمد نے یہ بات کہی اور نہیں ہوئی، یا جو واقعہ ہوا ہو، اس کے خلاف آپ نے کوئی بات کہی ہو۔ کہیں سے کوئی ایک ثبوت بھی نہیں ہے۔ اور جھوٹے نبیوں کا یہ حال ہے کہ ہر دم ان کا جھوٹ کھلتا رہتا ہے۔

قادیانی کا بطلان:

ابھی ماضی قریب میں قادیان میں ایک صاحب پیدا ہو گئے، اللہ جانے کیا خبط سوار ہوا؟ اچھا خاصا پڑھا لکھا آدمی تھا، مگر اس نے نبوت کا دعوا کر دیا اور اس کو نبھانے کی ہر کوشش کی۔ قرآن کی اس آیت کی تاویل میں کہتا تھا کہ ’وہ خاتم النبیین ہیں، مگر میں ذیلی نبی ہوں، نبوت کا سایہ ہوں۔

ایک زمانہ میں قادیانیوں کا بڑا شور تھا۔ یہ اندر اندر تحریکیں چلاتے اور بے پڑھے لکھے لوگوں کو طرح طرح سے مال وزر دے کر اور امداد کر کے ورغلاتے رہتے تھے۔ ہمارے علما نے ان کا تعاقب کیا اور خوب تعاقب کیا، بہت محنت کی۔ عطاء اللہ شاہ بخاری، علامہ انور شاہ کشمیری، مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا محمد علی مونگیری اور ان کے علاوہ دیگر بہت سے حضرات نے۔ اتنی محنت کی ان لوگوں کے خلاف کہ اللہ نے حق کو حق

اور جھوٹ کو جھوٹ ظاہر کر دیا۔

مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری کی قادیانیوں سے چلتی رہتی تھی۔ایک مرتبہ غلام احمد قادیانی نے کہا کہ ’میں نے اللہ سے دعا کی ہے کہ اگر میں حق پر ہوں تو ثناء اللہ امرتسری میری زندگی میں مرجائے، اور اگر ثناء اللہ حق پر ہے تو میں اس کی زندگی میں مرجاؤں۔‘ وہ اپنی تمام دعاؤں اور پیش گوئیوں کا اشتہار چھاپا کرتا تھا،اس کا بھی اشتہار بڑے زور وشور سے شایع کیا تھا۔اور اس کے کچھ دنوں کے بعد مرگیا اور مولانا ثناء اللہ صاحب اس کے بعد ۴۸/ سال زندہ رہے۔مولانا کہا کرتے تھے کہ قادیانی کے باطل ہونے کی ایک بڑی دلیل میں بھی ہوں کہ میں چل رہا ہوں اور وہ مرگیا،اس کا جھوٹ اور بطلان واضح ہوگیا۔

ختم نبوت اور نزولِ مسیح:

رسول اللہ ﷺ خاتم النبیین ہیں۔خاتم کے معنی مہر کے آتے ہیں۔یعنی نبوت آپ پر ختم ہوگئی،اس پر مہر لگادی گئی ہے۔مہر اس چیز پر لگائی جاتی ہے جس کو ہر طرح سے بند کرنا ہوتا ہے۔آپ کی آمد کے بعد نبوت کا دروازہ بند ہوگیا ہے،اس لیے اب ہر اس شخص پر جو صاحبِ ایمان ہے،ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا احترام کرے۔کیوں کہ ہر صاحبِ ایمان آپ کی روحانی اولاد ہے۔

ایک مسئلہ ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام جو ایک جلیل القدر پیغمبر ہیں،وہ قیامت کے قریب دنیا میں تشریف لائیں گے۔عیسی علیہ السلام اُن نبیوں میں سے ہیں جو نہایت شفیق اور مہربان تھے۔حضور اکرم ﷺ حضرت ابوبکر صدیق کو تشبیہ دیا کرتے تھے کہ ابوبکر کی مثال ایسی ہے جیسے ابراہیم علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام۔یعنی مہربانی اور شفقت میں ان انبیا کی طرح ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد دجال کو ختم کرنے کے لیے ہوگی۔دنیا میں گمراہی بہت پھیل چکی ہوگی،اس کو ختم کرنے کے لیے عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے۔تو کیا

عیسیٰ علیہ السلام کی جب دنیا میں آمد ہوگی تو ان کے پاس نبوت نہیں ہوگی؟ ہوگی، کیوں کہ کسی بھی نبی کی نبوت کبھی ختم نہیں ہوتی ہے، ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ لہٰذا ان کو جو نبوت حضور ﷺ کی آمد سے پہلے ملی تھی، وہی نبوت ان کی دنیا میں آمد کے وقت بھی رہے گی۔ تو گویا کہ وہ آپ ﷺ کے بعد نئے نبی نہیں بنائے گئے ہیں، بلکہ نبوت پرانی ہے، بس دنیا میں ان کی آمدِ ثانی نئی ہے۔

نزول کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کس شریعت پر عمل کریں گی؟

پھر ایک سوال ہوگا کہ کیا عیسیٰ علیہ السلام اپنی شریعت لے کر آئیں گے یا حضور ﷺ کی شریعت پر عمل کریں گے؟ تو علما نے لکھا ہے کہ وہ اپنی شریعت پر عمل نہیں کریں گے بلکہ حضور ﷺ کی شریعت کے مطابق عمل کریں گے۔ کیوں کہ حدیث میں آتا ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے نزول ہوگا، اس وقت نماز کا وقت ہوگا۔ جس مسجد میں آپ کا نزول ہوگا، اس کے امام مہدی علیہ السلام ہوں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب مسجد کے اندر تشریف لے جائیں گے تو حضرت مہدی ان کو پہچان کر مصلے سے ہٹنے لگیں گے، مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام انھیں مصلی پر کھڑا کر دیں گے اور ان کی اقتدا میں نماز ادا کریں گے۔ حضرت مہدی حضور ﷺ کے امتی ہیں، تو ظاہر سی بات ہے کہ وہ نماز بھی شریعتِ محمد یہ والی ہی پڑھائیں گے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کی اقتدا کر رہے ہیں تو وہ بھی شریعتِ محمد یہ ہی کے مطابق نماز پڑھیں گے، نہ کہ اپنی شریعت کے مطابق۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبی ہیں، وہ دنیا میں تشریف لائیں گے تو بھی نبی ہی ہوں گے، مگر ایسے نبی جو ایک دوسرے نبی کا امتی ہوگا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جو نزول ہوگا، وہ بھی آپ ﷺ ہی کے طریقے اور آپ ہی کی شریعت پر ہوگا۔ اس لیے آپ کے بعد جتنے بھی نبوت کا دعوا کرنے والے ہیں سب جھوٹے ہیں، سب غلط ہیں۔ آج تک کوئی شخص ایسا نہیں ہوا جس نے نبوت کا جھوٹا دعوا کیا ہو، اور اس کا جھوٹ نہ کھلا ہو۔

امت کے لیے شرف کی بات:

اس امت کے لیے شرف کی بات ہے کہ ایسا نبی ملا جس کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، اب آدمی کو کسی کا انتظار نہیں کرنا ہے، سارا تعلق انھیں سے جوڑ کر رکھنا ہے۔ اگر یہ بھی نہ ہوسکا تو بڑی محرومی کی بات ہے۔

وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمًا ۔اور اللہ تعالی ہر چیز کو جانے والے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کون کس کا اہل ہے۔

اللہ تعالی ہم سب کو صحیح ایمان کی توفیق عطا فرمائے۔

❑❑❑

ایمان کی بنیادی شرط

الحمدلله رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ وصحبہ اجمعین۔

اَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَی اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَمْرًا اَنْ یَکُوْنَ لَھُمُ الْخِیَرَۃُ مِنْ اَمْرِھِمْ وَمَنْ یَعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِیْنًا﴿۳۶﴾

وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوَاہُ تَبْعًا لِمَا جِئْتُ بِہٖ۔[الاربعین النوویہ:۴۱]

محترم بزرگو اور دوستو! میں نے سورہ احزاب کی ایک آیت پڑھی ہے۔ قرآن پاک میں ایک سو چودہ سورتیں ہیں، ہر سورت ایک مستقل کتاب ہے تو گویا ایک سو چودہ کتابیں ہیں جن کا مجموعہ قرآن پاک ہے، اور سب مل کر ایک کتاب ہے۔ اللہ تعالی نے ہر سورہ کے اندر امت کی، انسانوں کی ہدایت کے لیے کچھ خاص باتیں بیان فرمائی ہیں۔ سورہ احزاب میں اللہ تعالی نے اپنے آخری نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق وآداب اور ان کے ساتھ امت کو کیا معاملہ کرنا ہے؟ ان کی عظمت کیا ہے؟ ان کے اوپر اللہ تبارک وتعالی کی کیا کیا عنایتیں ہیں؟ ان باتوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اللہ کے رسول کے اوصاف اور آپ کے کمالات کا بیان کرنا اللہ تعالی ہی کو زیبا ہے۔ اس لیے کہ اللہ ہی نے پیدا کیا، انھوں نے ہی پیغمبر بنایا، وہی زیادہ بہتر جانتے ہیں کہ حضور اکرم

ﷺ کو کیا کیا نعمتیں عطا کی گئیں ہیں؟ ہم اپنے چھوٹے سے دماغ سے، چھوٹی سی عقل سے سوچیں گے تو کہاں تک سوچیں گے؟ ہماری سوچ کہاں تک جائے گی؟ اس لیے اللہ ہی بہتر جانتے ہیں کہ رسول کا مرتبہ اور مقام کیا ہے؟

اگر آدمی صرف ایک رکوع کو سمجھ کر پڑھ لے تو رسول اللہ ﷺ کے مقام اور مرتبہ اور ان کے ساتھ امت کو کیا معاملہ کرنا ہے؟ ساری باتیں معلوم ہو جائیں گی۔ ورنہ آپ ﷺ کے مقام و مرتبہ تک کوئی سوچ تک نہیں سکتا، چاہے کتنا ہی سوچے۔

نبوت اور امتحان:

آپ اللہ کے نبی تھے، جب آپ نے نبوت کا اظہار کیا تو بہت سے لوگ امتحان کے لیے آئے۔ ظاہر سی بات ہے کہ ایک آدمی اگر کہے کہ 'میرے اندر یہ بات ہے تو لوگ ایسے ہی نہیں مان لیں گے، امتحان لیں گے، اس کے کمالات کو جانچیں گے۔' حضور اکرم ﷺ جب ابتدا میں تشریف لائے تو آپ کا مقابلہ مخالفت سے ہوا، ماننے والے کم رہے، تھوڑے رہے، پھر آہستہ آہستہ بڑھتے رہے۔ کسی نے کہا ہے کہ:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

حضور اکرم ﷺ جب چلے تھے تو بالکل اکیلے تھے، سب سے پہلے جو آپ کے ساتھ شریک ہوا، وہ آپ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا عورتوں میں، اور مردوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔ اور پھر اس کے بعد مخالفت کا ایک طوفان چل پڑا، بڑی مخالفت ہوئی، ہر ایک کہتا کہ 'یہ کیا تھے اور کیا ہو گئے؟ ہمارے درمیان پیدا ہونے والا آدمی آج نبی ہو گیا؟' سب کو اس پر حیرت تھی کہ یہ کہتے ہیں کہ بتوں کی پوجا مت کرو، غیر اللہ کی عبادت مت کرو، اس پر سب چراغ پا تھے۔ ہر ایک امتحان لیتا کہ دیکھیں کہ یہ اللہ کے نبی ہیں کہ نہیں؟ پڑھے لکھے لوگ اپنے حساب سے، غیر پڑھے لکھے اپنے حساب سے۔ اس پر ایک لطیفہ بھی ہوا۔ سب کو معلوم ہے کہ آپ ﷺ نے بچپن میں

بکریاں چرائیں ہیں اور آپ کا ارشاد ہے کہ ’ہر نبی نے بکری چرائی ہے۔[ابن ماجہ: ۲۱۴۹] حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دس سال بکریاں چرائیں۔ حضور ﷺ نے بھی بچپن میں بکریاں چرائیں، آپ کے ساتھ دوسرے لوگ بھی تھے۔ بچپن کا زمانہ تھا۔ جب آپ کو نبوت ملی تو ایک بار اس طرف تشریف لے جانا ہوا جدھر چرواہے بکریاں چرایا کرتے تھے۔ وہاں ایک بڑے پہلوان سے ملاقات ہوئی۔ اس کی طاقت کا یہ عالم تھا کہ عرب میں وہ ایک دوسوآدمی کے برابر جانا جاتا تھا۔ یعنی ایک دوسوآدمی میں جتنی طاقت ہوسکتی ہے، اتنی اس آدمی میں تھی۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ اونٹ کا چمڑا بہت مضبوط اور موٹا ہوتا ہے۔ اونٹ کا چمڑا زمین پر رکھ دیا جاتا اور اس پر وہ دونوں پاؤں رکھ کر کھڑا ہو جاتا، دسیوں آدمی مل کر اس چمڑے کو کھینچتے، چمڑا ٹوٹ جاتا تھا، مگر اس آدمی کے پاؤں سے نکلتا نہیں تھا۔ اتنا طاقت ور تھا۔ اور یہ کوئی حیرت کہ بات نہیں۔

مولانا طاہر معروفی صاحب کا زورِ بازو:

ہمارے علاقہ میں پورہ معروف ایک بستی ہے، جہاں ایک عالم دین مولانا طاہر صاحب تھے۔ عالم ہونا اور پہلوان ہونا بڑی حیرت کی بات ہوتی ہے، جیسے عالم ہونا اور مال دار ہونا حیرت کی بات ہے۔ مولانا طاہر صاحب پہلوان تھے، طاقت بہت تھی۔ ایک مرتبہ بقرعید کے موسم میں اپنے قربانی کے بکرے کو درخت کی ایک شاخ جھکا کر کھلا رہے تھے۔ ایک پہلوان آیا اور اس نے کہا ’مولانا صاحب! یہاں کوئی مولوی طاہر صاحب ہیں؟‘ کہا ’کیوں کیا بات ہے؟‘ کہا ’سنا ہے کہ بہت بڑے پہلوان ہیں، ہم دیکھنے آئے ہیں کہ کتنے بڑے پہلوان ہیں۔‘ انھوں نے پوچھا کہ ’ان سے ملاقات کرنی ہے؟‘ کہا ’ہاں ملیں گے۔‘ کہا ’اچھا ایک کام کیجیے کہ یہ شاخ پکڑ کر پتی کھلایئے، میں بلا لاتا ہوں۔‘ جیسے یہ ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے تھے، ویسے اس نے ایک ہاتھ سے پکڑ لیا۔ مولانا نے کہا کہ ’دونوں ہاتھ سے پکڑ لیجیے۔‘ کہا ’دونوں ہاتھ سے پکڑنے کی کیا ضرورت؟ آپ نے ایک ہاتھ سے پکڑ رکھا تھا، میں بھی ایک ہاتھ سے پکڑوں گا۔‘ مولانا نے وہ شاخ پکڑا

دی، جیسے ہی مولانا نے شاخ چھوڑی، شاخ کے ساتھ یہ بھی اوپر چلا گیا اور ٹنگ گیا۔ اب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آئے کہ یہ کیا ہو گیا۔ کہنے لگا 'کیا آپ ہی مولانا طاہر ہیں؟' کہا 'جی میں ہی ہوں۔' کہا 'مان گئے، ہم نہیں سمجھتے تھے کہ آپ کے پاس اتنی طاقت ہے۔' بس اللہ تعالیٰ کسی کو اتنی طاقت دیدیتے ہیں۔

جبریل امین کی طاقت:

خیر تو وہ آدمی بہت پہلوان تھا، عربوں میں پہلوانوں کے بارے میں یہ مشہور ہوتا تھا کہ فلاں آدمی سو کے برابر ہے، فلاں آدمی ایک ہزار کے برابر ہے۔ قرآن پاک میں جہنم پر متعین فرشتوں کے بارے میں آیا ہے: عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ۔ [المدثر: ۳۰] جہنم پر جو فرشتے مقرر ہیں ان کی تعداد اُنیس ہے۔ قریش کا ایک پہلوان مذاقاً کہا کرتا تھا کہ 'اُنیس ہیں تو سترہ سے میں نمٹ لوں گا اور دو سے تم لوگ نمٹ لینا، جہنم ہمارے قبضہ میں رہے گی، ہم جو چاہیں گے کریں گے۔' وہ سمجھتا تھا کہ فرشتوں کو اُتنی ہی طاقت ہوتی ہے جتنی کہ آدمی کو۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ فرشتہ کی طاقت کچھ اور ہوتی ہے۔ فرشتے اتنے طاقتور ہوتے ہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے چھ سو بازو ہیں۔ [بخاری: ۳۲۳۲] حدیث شریف میں آتا ہے کہ قوم لوط کو جب ہلاک کرنا ہوا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اللہ نے بھیجا، انھوں اپنے ایک بازو کو زمین میں گاڑ دیا اور دوسرے کو اٹھایا ہے تو آسمان تک لے کے چلے گئے۔ پورے کو شہر کو ہاتھ میں اٹھالیا اور اوپر لے جا کر الٹ دیا۔ سب ہلاک ہو گئے۔ قوم لوط ایک بڑے گناہ میں مبتلا تھی، اس لیے اللہ کا عذاب آیا۔ آج بھی وہ زمین موجود ہے، وہاں کا پانی کالا ہے، اس کو بحیرہ مردار کہتے ہیں۔ اُردن کے علاقہ میں ایک جھیل ہے، وہ اصل میں جھیل نہیں بلکہ ایک بڑا شہر تھا۔ اسی شہر میں ان سبھوں کو انڈیل دیا گیا تھا۔ اب وہ غیر آباد ہے، وہاں پانی ہی پانی ہے اور پانی بھی سیاہ بدبودار۔ اس پانی کی خاصیت یہ ہے کہ کوئی جاندار اس پانی میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ مچھلی اس میں نہیں پائی جاتی، مینڈک اس میں نہیں پایا جاتا، کوئی پانی کا جانور اس میں نہیں پایا جاتا۔ اگر پانی

کا جانور اس میں ڈال دیا جائے تو فوراً مر جائے گا، بچ نہیں سکتا۔ یہ اللہ تعالی کا عذاب ہے۔

میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جبرئیل علیہ السلام کے بازو میں اتنی طاقت ہے، وہ بڑے سے بڑا شہر اٹھا کر پٹخ دیتے ہیں۔ اور وہ بے وقوف یہ سمجھتا تھا کہ سترہ کے لیے میں کافی ہوں اور دوسے تم لوگ نمٹ لینا۔

آمدم برسرِ مطلب:

بہر حال! جس پہلوان کا میں ذکر کر رہا تھا وہ بہت طاقت ور تھا۔ حضور اکرم ﷺ جب ادھر سے گزرے تو اس نے کہا کہ 'سنا ہے آپ نبی ہو گئے ہیں، اللہ کے ساتھ آپ کا کوئی خاص تعلق ہو گیا ہے۔' آپ نے فرمایا 'میں نبی ہوں، اللہ نے مجھے بھیجا ہے، تم کلمہ پڑھ لو۔' کہنے لگا 'ہم نبی آپ کو اس وقت مانیں گے جب کشتی میں آپ ہم کو پچھاڑ دیں۔' اللہ اکبر! نبی جو انسان کی ہدایت کے لیے آتے ہیں نہ کہ کشتی میں پچھاڑنے کے لیے۔ مگر قربان جایئے! اللہ تعالی نے اپنے پیغمبر کو کامل اور مکمل بنا کر بھیجا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے کشتی لڑی اور تین بار اس کو بچھاڑا۔ گویا کہ کشتی کے راستے بھی آپ نے اپنی حقانیت ثابت کر دی۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام:

روایت میں کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ جب حضور اکرم ﷺ کے پاس آئے تو چند علامتیں لے کر آئے تھے۔ ان کے عیسائی استاذ نے کہا تھا کہ 'مدینہ جاؤ اور وہاں ایک پیغمبر ہیں، ان کی خصوصیت یہ ہوگی کہ اگر صدقہ کا مال ہوگا تو نہیں کھائیں گے، زکوۃ کا مال دوگے تو نہیں کھائیں گے اور اگر ہدیہ ہوگا تو خود بھی استعمال کریں گے اور دوسرے کو بھی کھلائیں گے۔' اور تیسری بات یہ بات بتائی تھی کہ 'ان کے دونوں مونڈھوں کے درمیان گوشت کا ایک حصہ اُبھرا ہوا ہوگا، وہ مہرِ نبوت ہوگی۔' اگر یہ علامات تم پا جاؤ تو سمجھو کہ وہ اللہ کے نبی ہیں، اور اگر یہ علامات نہ ملے تو سمجھو کہ وہ اللہ کے نبی نہیں ہیں۔'

حضرت سلمان فارسی سچے دین کی تلاش میں صدق طلب کے ساتھ مدینہ طیبہ کے لیے نکلے۔بھٹکتے بھٹکاتے، غلام بنتے بناتے مدینہ پہنچ گئے۔پہنچنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بغرض امتحان کھانے کی کوئی چیز لے گئے اور کہا ’حضرت! یہ صدقہ ہے۔‘ آپ نے غریبوں میں اس کو تقسیم کرا دیا،خود کچھ نہیں لیا۔انھوں نے دل میں سوچا کہ ایک بات ہوگئی جو بات استاذ نے بتائی تھی۔کچھ دن کے بعد پھر آئے، پھر کھانے ہی کی کچھ چیز لے کر آئے اور عرض کیا کہ ’حضور! اس کو قبول فرما لیجیے، یہ میری طرف سے ہدیہ ہے۔‘ آپ نے اس کو قبول فرمالیا اور خود بھی اس میں سے چکھا اور تمام مجلس والوں کو بھی کھلایا۔ دوسری بات بھی ہوگئی۔اب تیسری بات کی تلاش ہے کہ دونوں مونڈھوں کے درمیاں مہر نبوت ہے یا نہیں؟ بقیع الغرقد میں رسول اللہ ﷺ کسی صحابی کے جنازے میں شریک تھے، وہیں حضرت سلمان فارسی آکر ملے اور سلام کیا، پھر گھوم کر آپ کی پشت کی طرف آگئے، آپ کے بدن مبارک پر دو چادر پڑی ہوئی تھی۔آپ کا یہی لباس تھا، ایک لنگی باندھتے تھے اور چادر اوڑھتے تھے۔ یہ آپ کا عام لباس تھا۔آپ ﷺ کو احساس ہوا تو آپ نے دھیرے سے چادر کو ہٹا دیا اور مہر نبوت سامنے آگئی، حضرت سلمان فارسی نے مہر نبوت کو دیکھ لیا اور چمٹ کر بوسہ دینے لگے۔اس کے بعد انھوں نے عرض کیا کہ ’حضرت! تین علامتوں کی تلاش تھیں اور تینوں مجھ کو مل گئیں، اب میں آپ کے ہاتھ پر ایمان لاتا ہوں۔‘

[السلسلة الصحيحة:۲۶۳]

ہم ان کے اوصاف کیا بیاں کریں! ہم تو واقعہ بیان کر سکتے ہیں، باقی اندر کیا کمالات تھے؟ کیا خاص بات تھی؟ اس کو بیان کرنا کسی کے بس کی بات نہیں، ان کو تو اللہ تعالی ہی بیان کر سکتے ہیں۔پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کو اللہ تعالی نے ہر طرح سے کامل بنایا ہے۔

اصل مدعا:

میری بات تو رہ ہی جائے گی، میں دوسری طرف چلا گیا۔میں یہ بتانا چاہ رہا

ہوں کہ امتحان لینے والے آتے رہتے تھے اور ہر کوئی اپنے اعتبار سے امتحان لیتا تھا۔ کوئی پہلوانی کے عنوان سے امتحان لینے آتا تھا، کوئی کسی عنوان سے۔ حضور اکرم ﷺ کی مجلس میں ایک یہودی عالم آیا اور علم کے اعتبار سے آپ کا امتحان لینے کی کوشش کی کہ 'دیکھیں کچھ علم ہے کہ نہیں؟ کچھ جانتے بھی ہیں یا ایسے ہی نبی بن گئے ہیں؟' جو جھوٹا نبی ہوتا ہے وہ ہمیشہ جہالت کی بات کرتا۔ حضور اکرم ﷺ کے بعد کوئی نبی ہونے والا تو ہے نہیں، حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ 'قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ تیس کے قریب جھوٹے دجال پیدا نہیں ہوں گے، ان میں سے ہر ایک دعوا یہ ہوگا کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔ [مسند احمد: ۱۲۸۹۹] اور واقعی نبوت کا دعوی کرنے والوں کی قطار لگ گئی۔

خدائی کا دعویدار:

ایک بڑے بزرگ تھے، وہ ایک جگہ گئے تو دیکھا کہ ایک آدمی دعوا کر رہا تھا کہ 'میں خدا ہوں۔' کبھی فرعون نے خدائی کا دعوا کیا تھا اور اب اس نے خدائی کا دعوا کیا۔ وہ بزرگ اس سے ملے اور کہا کہ 'صاحب! آپ یہاں مل گئے، ہم تو آپ کو بہت ڈھونڈ ھتے رہے، مکہ گئے، مدینہ گئے، کہاں کہاں گئے، ہر جگہ آپ کو تلاش کیا، آپ یہاں ملے۔ اس پر ہاتھ پھیرا، بوسہ دیا۔ وہ بڑا خوش ہوا کہ ہمارا ایک اچھا بندہ مل گیا ہے۔ ان کے پاس کچھ سوکھی روٹی تھی، انھوں نے وہ روٹی اس کی طرف بڑھائی اور کہا 'یہ میری طرف سے آپ کو ہدیہ ہے۔' اس نے کہا 'تم اپنے خدا کو سوکھی روٹی دیتے؟' کہا 'جیسی آپ نے دی تھی، ویسی ہی دے رہا ہوں۔ یہی روٹی آپ نے دی ہے یہی دے رہا ہوں۔' وہ چپ ہو گیا، پھر انھوں نے پوچھا کہ 'قرآن تو آپ ہی نے نازل فرمایا ہے۔' کہا 'ہاں۔' کہا 'ایک آیت میں علما نے بڑا اختلاف کیا ہے، آج آپ مل گئے ہیں، اس لیے آپ ہی سے پوچھ لیتا ہوں، آپ سے بڑھ کر تو کوئی جاننے والا نہیں۔' تو وہ کہتا ہے کہ 'میں تو جاہل ہوں۔' ایک جھاپڑ لگایا کہ 'جاہل ہے اور خدا بنتا ہے۔' گمراہ کرنے والے اس طرح کا معاملہ کرتے ہیں، ایسے ہی کوئی جھوٹی نبوت والا ہوتا ہے، وہ غلط سلط باتیں کرتا ہے۔

یہودی عالم کا علمی سوال:

پیغمبر علیہ السلام کا وہ یہودی عالم امتحان لے رہا تھا کہ دیکھیں کہ یہ سچے نبی ہیں یا جھوٹے نبی ہیں؟ علم کے عنوان سے امتحان لے رہا تھا، مگر یہاں اللہ نے کوئی کمی تو رکھی نہیں تھی۔ آ کر پوچھتا ہے کہ 'آپ اللہ کے نبی ہیں، آپ یہ بتائیے کہ پوری روے زمین پر کون سی سرزمین اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہے؟' حضور ﷺ کے پاس اس کا علم اس وقت نہیں تھا، اللہ کی طرف سے اس کا علم دیا نہیں گیا، آپ اپنے جی میں کہتے ہیں: اَسۡکُتُ حَتّٰی یَجِئُ جِبۡرَئِیۡلُ۔ میں چپ ہی رہوں گا، یہاں تک کہ جبریل آ جائیں۔ اللہ کے رسول ہیں، تذبذب سے کوئی جواب دینا ان کے شایان شان نہیں ہے۔ جبریل آئیں گے، ان سے پوچھوں گا، وہ بتائیں گے تو جواب دوں گا۔ اللہ نے جبریل کو حکم دیا کہ 'جاؤ! نبی انتظار کر رہے ہیں۔' جبریل پہنچے، حضور ﷺ نے دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔ پوچھا 'یہ بتائیے کہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ اور سب سے بہترین زمین کون سی ہے؟' جبریل آئے تو تھے مگر علم لے کر نہیں آئے تھے، اللہ نے ایسے ہی بھیج دیا تھا، خالی آ گئے تھے۔ انھوں نے کہا 'آپ جو پوچھ رہے ہیں، اس کے بارے میں آپ سے زیادہ میں بھی نہیں جانتا۔' حضور ﷺ نے فرمایا کہ 'اچھا، اللہ سے پوچھ کر آئیے۔' جبریل کی رفتار کا کیا کہنا، ہمارے خیال سے زیادہ تیز، ہمارا خیال نہیں پہنچے گا جہاں تک وہ پہنچ جائیں گے۔ چنانچہ وہ فوراً گئے، مجلس اب بھی ویسے ہی قائم ہے، لوگ بیٹھے ہیں، وہ یہودی بھی بیٹھا ہے۔ حضرت جبریل آئے اور پلٹ کر گئے اور وہاں سے علم لے کر آ بھی گئے، کوئی بہت دیر نہیں لگی ہے، لیکن اس مرتبہ آئے تو جبریل کا رنگ بدلا ہوا تھا، بہت خوش تھے، خوشی سے چہرہ جگمگا رہا تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے دیکھا تو خوشی ان کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔ آتے ہی سوال کا جواب دینے کے بجائے کہتے ہیں کہ 'اے اللہ کے رسول! آج جتنا میں اللہ کے قریب ہو گیا ہوں، کبھی نہیں ہوا تھا۔' ہر فرشتہ کا ایک متعین مقام ہے جہاں سے وہ آگے نہیں جاتا: وَمَا مِنَّا اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَعۡلُوۡمٌ۔ [الصافات: ۱۶۴] خود حضور ﷺ کے ساتھ معراج میں

حضرت جبریل گئے تھے، کچھ دور جا کے رک گئے، حضرت نے فرمایا 'چلیے۔' کہا 'نہیں ہمارا مقام یہیں تک ہے، ہم اس سے آگے نہیں جا سکتے۔' مگر آج کہتے ہیں کہ 'میں اتنا قریب پہنچا، اتنا قریب پہنچا کہ کبھی اپنی زندگی میں اتنا قریب نہیں پہنچا تھا۔ حضور ﷺ نے پوچھا 'کیا ہوا؟ کتنے قریب ہوئے تھے؟' کہا 'میرے درمیان اور اللہ کے درمیان صرف ستر ہزار نور کے پردے تھے۔' علما نے اِس قُرب کی توجیہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 'جبریل کے اپنے مرتبے سے آگے پہنچنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس مرتبہ حضور ﷺ کے قاصد بن کر گئے تھے۔ اور قاصد اس جگہ تک پہنچ جاتا ہے جہاں تک اصل کی رسائی ہوتی ہے۔ حضرت جبریل اس وقت وہاں تک پہنچ گئے، جہاں تک رسول اللہ ﷺ کی رسائی ہے۔

اب اندازہ کیجیے کہ حضور ﷺ کی رسائی کہاں تک ہے! جبریل جیسا جلیل القدر فرشتہ حضور ﷺ کی برکت سے اور آپ کے طفیل میں وہاں تک پہنچا جہاں تک اس سے پہلے کبھی نہیں پہنچا۔ اب سوچتے رہیے کہ آپ ﷺ کہاں تک پہنچے رہے ہوں گے اور کتنا بلند مرتبہ ہوگا۔

بہتر اور بدتر زمین:

بہرحال! جب یہ بات ہوگئی تب حضرت جبریل نے جواب دیا کہ 'اللہ کے نزدیک سب سے بہتر زمین مسجد ہے، اور سب سے بدتر زمین بازار ہے۔' [مشکوۃ: ۷۴۱]

مسجد کی زمین وہ زمین ہے جہاں ایک مرتبہ مسجد بن گئی تو قیامت تک مسجد ہی رہے گی، اب اس کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مسجد حرام بنائی، بعد میں کفار کا اس پر قبضہ ہو گیا، سیکڑوں بت رکھے گئے، مگر بت کدہ نہیں بنا، وہ اس وقت بھی مسجد تھی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ آئے تو ایک ایک بت نکال دیا، اور وہ مسجد آج بھی مسجد ہے۔ مسجد وہ جگہ ہے جو ہمیشہ مسجد رہے گی۔

مسجد پر کسی کا تسلط نہیں ہوسکتا:

مشہور ہے کہ خلیفہ ہارون رشید نے ایک مرتبہ غصے میں اپنی بیوی سے کہہ دیا کہ

'اگر راتوں رات میں نے تم کو اپنی سلطنت سے باہر نہ کیا تو تم کو تین طلاق۔' کہنے کو تو کہہ دیا مگر اس کی حکومت اتنی بڑی تھی کہ راتوں رات نکالنا ناممکن تھا۔ ہوائی جہاز کا زمانہ ہوتا تو نکال سکتا تھا۔ اس کی حکومت کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ چھت پر بیٹھا ہوا تھا، بادل جا رہا تھا، تو بادل کو مخاطب کر کے کہتا تھا کہ 'اے بادل! جہاں جی چاہے برس، تیری آمدنی کا خراج میرے ہی پاس آئے گا۔' اتنی لمبی چوڑی حکومت تھی۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اس کے قاضی القضاۃ تھے، ان کو بلایا اور صورتِ حال ان کے سامنے رکھی اور کہا 'اب کوئی صورت بتائیے کہ طلاق نہ پڑے۔' انھوں نے کہا کہ 'یہ کون سی مشکل بات ہے، بیوی کو مسجد میں بیٹھا دیجیے، مسجد میں آپ کی حکومت نہیں ہے، مسجد اللہ کا گھر ہے، وہ آپ کی حکومت کے حدود سے باہر ہے۔'

سب سے بڑی چیز ہے مسجد، سب سے عمدہ جگہ ہے مسجد۔ آدمی مسجد میں گیا اور نماز کے انتظار میں بیٹھا رہا تو مسلسل عبادت میں لکھا جا رہا ہے، ایک نماز پڑھ چکا ہے اور دوسری نماز پڑھنے کے لیے مسجد ہی میں رکا رہا، مسجد سے نہیں نکلا ہے تو جب تک مسجد میں بیٹھا رہتا ہے، فرشتے اس کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں، جب مسجد سے باہر نکل جاتا ہے تب فرشتوں کی دعا بند ہوتی ہے۔ مسجد میں جانا بذات خود ایک عبادت ہے۔

اور سب سے بدتر جگہ بازار ہے، جہاں سے ہم لوگوں کو بڑی دلچسپی ہے، یہ خراب جگہ ہے، یہاں ضرورت کے مطابق جانا چاہیے، مگر لوگ مستقل بیٹھے رہتے ہیں۔

نبی کی اطاعت اللہ ہی کی اطاعت ہے:

خیر میں بتا رہا تھا رسول اکرم ﷺ کے مقام اور مرتبہ کو۔ کہاں تک بیان کروں، نہ میرے بس کی بات ہے کہ بیان کروں اور نہ کسی انسان کے بس کی بات ہے کہ وہ ادراک کر سکے۔ میں نے جو آیت پڑھی ہے، اسی آیت کو مجھے بیان کرنا تھا اور اب اس آیت کو میں بیان کرتا ہوں۔ سورہ احزاب کی ایک آیت کی تلاوت میں نے کی تھی، اللہ تعالی فرماتے ہیں: وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَكُوْنَ

لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۔ کسی ایمان والے مرد یا کسی ایمان والی عورت کے لیے اس بات کی گنجایش نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کے رسول کسی چیز کا فیصلہ کر دیں تو ان کے لیے اس چیز میں کوئی اختیار رہو۔ آپ جانتے ہیں کہ اللہ اور رسول کا فیصلہ الگ نہیں ہوتا، جو رسول کا فیصلہ ہے، وہی اللہ کا فیصلہ ہے، اور جو اللہ کا فیصلہ ہے وہی رسول کا فیصلہ ہے۔ جب دونوں کا ذکر ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ کا فیصلہ الگ اور رسول کا فیصلہ الگ ہے۔ جہاں اللہ کا فیصلہ ہوتا ہے تو رسول اس فیصلے کے ترجمان ہوتے ہیں، اسے بتاتے ہیں کہ یہ اللہ ہی کا فیصلہ ہے۔ رسول کے منھ اور زبان سے جو ظاہر ہوتا وہ اللہ ہی کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالی فرماتے ہیں: مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى۔ [النجم: ۳-۴] رسول اپنی جانب سے کچھ نہیں کہتے، وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ اللہ کی طرف سے وحی ہوتی ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۔ [النساء: ۸۰] جو رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اللہ اور رسول کے فیصلہ میں دوئی نہیں ہے بلکہ اتحاد ہے۔ اس لیے اگر کسی امر کا اللہ نے یا اس کے رسول نے کوئی فیصلہ کر دیا یا حکم دیدیا تو کسی مسلمان مرد یا عورت کو اس سے سرمو انحراف جائز نہیں ہے، اس پر حرف بحرف عمل کرنا واجب ہے۔ یہی دین ہے، یہی ایمان ہے اور یہی سارے دین کا خلاصہ ہے۔

❑❑❑

درس قرآن

[جامع مسجد شہر اعظم گڑھ]

رسول اللہ ﷺ کی پانچ صفات

الحمدلله رب العالمین والصلوة والسلام علی سید المرسلین وعلی آله وصحبه اجمعین۔

اَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّا اَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِیْرًا﴿٤٥﴾وَدَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُنِیْرًا﴿٤٦﴾وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِیْرًا﴿٤٧﴾ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِیْنَ وَالْمُنَافِقِیْنَ وَدَعْ اَذَاهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَی اللّٰهِ وَكَفٰی بِاللّٰهِ وَكِیْلًا ﴿٤٨﴾[الاحزاب]

رسول اللہ ﷺ کا تعارف قرآن کی زبان سے:

حضرات محترم! یہ تین آیتیں ہیں جن کی میں نے ابھی تلاوت کی ہے، ان میں اللہ تبارک وتعالی نے جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا تعارف کرایا ہے اور یہ بتایا ہے کہ تمام انسانوں کے لیے آپ کی ذات کیا حیثیت اور مرتبہ رکھتی ہے؟ اس آیت میں اللہ نے خود پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کو مخاطب کیا اور آپ کا تعارف کرایا، اور حق یہ ہے کہ اللہ ہی اپنے پیغمبر کا تعارف کرا سکتے ہیں، دوسرا کوئی آپ کی صفات کو، آپ کے مقام کو، مرتبہ کو اپنے

طور پر پہچاننا چاہے تو پہچاننا ناممکن ہے۔ اس لیے اللہ نے جو اپنے پیغمبر کا تعارف کرا دیا ہے یا جو کچھ نبی کریم ﷺ نے اپنے بارے میں بتا دیا ہے، وہ بہت کافی ہے، اپنی طرف سے آپ کے لیے کوئی بات تجویز کرنا کسی کے لیے مناسب نہیں ہے۔ عام انسان اپنی طرف سے جناب نبی کریم ﷺ کے لیے مقام ومرتبہ کا تجویز کرے تو اس کی بات قابلِ سماعت نہیں ہوگی۔

اس سورت میں اللہ نے خاص طور سے جناب نبی کریم ﷺ کا مقام ومرتبہ متعین کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ آپ کے ساتھ امت کو کیا کرنا چاہیے؟ کیسا ادب ملحوظ رکھنا چاہیے؟ کیسا معاملہ کرنا چاہیے؟ اللہ نے اِن آیتوں میں نبی کریم ﷺ کی پانچ صفتیں بیان کی ہیں:

پہلی صفت شاہد اور اس کا معنیٰ ومفہوم:

پہلی صفت یہ ہے کہ اے نبی! ہم نے تم کو شاہد بنا کر بھیجا۔ شاہد کے معنیٰ گواہ کے آتے ہیں، گواہ ہر امت کے لیے، تمام انسانیت کے لیے، خود اپنی امت کے لیے اللہ نے آپ کو بنایا ہے، اور آخرت میں آپ ہی کی گواہی پر فیصلہ ہوگا۔ آپ ہی کو سب کے لیے معیار بنایا ہے۔ جو آپ کے طریقہ پر ہے، اس کے لیے آپ گواہ ہیں کہ 'یہ میرے طریقہ پر ہے۔' اور جو آپ کے طریقہ سے ہٹ گیا اس کے لیے آپ کی گواہی ہوگی کہ 'اس نے میرے خلاف کیا ہے اور میرے طریقہ سے ہٹ گیا ہے۔' یہ گواہی جس کے حق میں ہوگی اس کے لیے نجات یقینی ہے اور جس کے خلاف ہوگی اس کے لیے ہلاکت یقینی ہے۔

حدیث شریف میں آیا ہے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کو بلائیں گے اور پوچھیں گے کہ تمھارے پاس کوئی بشیر اور نذیر آیا تو وہ صاف انکار کر دیں گے، اور کہہ دیں گے کہ ہمارے پاس کوئی نہیں آیا، حالاں کہ نوح علیہ السلام ساڑھے نو سو سال تک ان کو تبلیغ کرتے رہے، مگر انسان کو جھوٹ کی عادت پڑی ہوئی ہے، وہاں بھی جھوٹ بولے گا۔ نوح علیہ السلام کہیں گے کہ 'پروردگار! میں ان کے

درمیان رہا، ان کو سمجھاتا رہا، ان کو بتاتا رہا۔' وہ انکار کریں گے کہ 'نہیں، کوئی نہیں آیا تھا۔' پھر نوح علیہ السلام سے پوچھا جائے گا کہ 'اس کے لیے آپ کی طرف سے کوئی گواہی دے سکتا ہے؟' تو حضرت نوح علیہ السلام گواہی میں امت محمدیہ کو پیش کریں گے اور کہیں گے کہ 'میری گواہی کے لیے امت محمدیہ ہے۔' امت محمدیہ شہادت کے لیے بلائی جائے گی، اور پوچھا جائے گا کہ 'کیا نوح اپنی قوم کے درمیان آئے تھے؟ اور ان کو صحیح اور سچی بات بتائی تھی؟ اور صحیح دین کی طرف رہنمائی کی تھی؟' امت محمدیہ کے لوگ کہیں گے کہ 'ہاں ہمیں معلوم ہے، یہ آئے تھے۔' [بخاری:۳۳۳۹] قوم نوح اعتراض کرے گی کہ 'یہ تو بعد کی پیداوار ہیں، یہ بعد کے لوگ ہیں، یہ کیسے گواہی دے سکتے ہیں؟' تو امت محمدیہ کے لوگ کہیں گے کہ 'ہم کو ہمارے پیغمبر نے بتایا تھا، اور وہ سب پر گواہ ہیں، ان کی گواہی سب کے اوپر ہے۔' تو اس طریقہ سے رسول اللہ ﷺ کی عظمت، بڑائی اور فضیلت تمام انسان پر ظاہر ہو جائے گی کہ آپ کی گواہی تو آپ کی گواہی ہے، آپ کی امت کی گواہی بھی معتبر ہوگی۔

دوسری صفت مبشر اور اس کا مفہوم:

آپ ﷺ کی دوسری صفت بیان کی گئی 'ومبشـــرا' بشارت دینے والے ہیں۔ بشارت دینے کی بڑی اہمیت ہے، آدمی کو خوش خبری مل جائے، اچھی خبر سننے کو مل جائے تو اسے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ پیغمبر علیہ السلام اس دنیا میں بشارت سنانے کے لیے آئے ہیں۔ آپ کو بشارت کا ایک واقعہ سناؤں: رسول اللہ ﷺ نے دو صحابی حضرت ابوموسی اشعری اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما کو معلم اور قاضی بنا کر یمن بھیجا تھا، دونوں کو ایک ساتھ روانہ کیا تھا اور فرمایا تھا: 'يَسِّـرَا وَلَا تُـعَسِّرَا، بَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا وَ تَطَاوَعَا وَ لَا تَخْتَلِفَا۔' [مسلم:۴۵۲۶] دیکھو! جا رہے ہو، وہاں بشارتیں سنانا، خوش خبریاں دینا، ایسی باتیں مت سنانا جس سے لوگوں میں تنفر پیدا ہو، اور لوگ بھاگ کھڑے ہوں۔ بشارت سناؤ گے تو لوگ آئیں گے، نفرت کی باتیں سناؤ گے تو لوگ بھاگیں گے۔ یہ آپ نے کہہ

کر بھیجا تھا اور یہ منصب خود رسول اللہ ﷺ کا ہے، اور میں آپ کو یہ بتادوں کہ یہ بشارت اور خوش خبری کسی واقعہ کے ہونے سے پہلے ہوتی ہے، جیسے کوئی کہے کہ 'ایک اچھی چیز آپ کو ملنے والی ہے۔' جب ملے گی تب ملے گی، ابھی ملی نہیں ہے، مگر محض اتنا سن کر آپ کا جی خوش ہوگیا۔

اس دنیا میں آدمیوں کا دستور یہی ہے کہ ایک چیز جس میں محنت کرتا ہے، کوشش کرتا ہے، کسی آدمی نے کہہ دیا کہ 'صاحب! آپ نے بہت محنت کی ہے، آپ کی محنت کو فلاں ذمہ دار صاحب تک پہنچا دیا گیا ہے اور انھوں نے وعدہ کرلیا ہے کہ آپ کو اتنی رقم آپ کی محنت کے عوض میں دی جائے گی۔' یہ سن کر وہ خوش ہوگیا، کب ملے گی یہ نہیں معلوم، لیکن اتنے ہی سے آدمی کی طبیعت خوش ہوجاتی ہے، اور یہی انسان کی حیات اور انسان کی زندگی کا ایک بڑا سبب بنتا ہے۔ انسان امید پر ہی جیتا ہے، یعنی آگے جو ملنے والا ہے، اس کی امید پر جی رہا ہے۔

انسان کا اصل ماضی، حال اور مستقبل کیا ہے؟:

انبیا علیہم السلام کی بشارت کا میدان یہ دنیا نہیں ہے، ہمارے زمانہ میں بہت تنگ نظری پیدا ہوگئی ہے کہ دنیا ہی کو ہم نے سب کچھ سمجھ لیا ہے، جو وقت گذر گیا اس کو ماضی، اور جو چل رہا ہے اس کو حال اور جو وقت آنے والا ہے اس کو ہم مستقبل قرار دے کر مطمئن ہوجاتے ہیں۔ اسی دنیا میں تینوں وقت ہم نے مان لیا ہے، آدمی اسی میں الجھ کر اسی کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے۔ انبیا علیہم السلام کی نظر اتنی تنگ نہیں ہے، ان کی نظر بہت وسیع ہے۔ دنیا میں آدمی کے بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کا جو وقت ہے، یہ سب کا سب ایک دن ہے، یا ایک دن سے بھی کم ہے، اور جو مستقبل ہے اس کی شروعات مرنے کے بعد ہوگی۔ یہ دنیا تھوڑی سی ہے، آدمی اپنی زندگی کا کچھ مرحلہ ماں کے پیٹ میں گذارا، تھوڑی مدت کے بعد پیٹ سے باہر دنیا میں آیا تو دنیا کی مدت زیادہ محسوس ہورہی ہے، اب سوچتا ہے کہ ماں کے پیٹ کی مدت تو کل نو مہینہ ہے، دنیا میں ہم اتنے دن تک رہے۔ اسی طرح

سمجھ لیجیے کہ جب دنیا سے جائیں گے اور قبر کی منزل میں پہنچیں گے تو قیامت تک کا جو عرصہ ہے، جو مرحلہ ہے، اس کے مقابلہ میں دنیا بہت ہلکی معلوم ہوگی، اور پھر اس کے بعد آخرت کا جو مرحلہ آئے گا، اس کے مقابلہ میں یہ پوری زندگی تھوڑی معلوم ہوگی۔

ہمارا مستقبل یہ دنیا نہیں ہے بلکہ مستقبل اس کے بعد آنے والا ہے، اور ماضی وہ ہے جب ہم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، اور ہماری روح عالم ارواح میں تھی، یہ دنیا تو حال ہے، چاہے اس دنیا میں آدمی سو سال رہے۔ سو سال بھی رہے گا تو ایک ہی دن ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے: وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّوْنَ۔ [الحج:۴۷] ایک دن اللہ کے نزدیک اتنا لمبا ہے جتنا تمھارا ایک ہزار سال۔ ظاہر بات ہے کہ اس حساب سے دیکھ لیجیے تو ہم میں سے کون ہے جو ایک ہزار سال جیتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی بشارت کا میدان دنیا نہیں ہے:

میں یہ بتا رہا تھا کہ انبیا علیہم السلام کی بشارتوں کا تعلق اس دنیا سے نہیں ہے، ساری بشارت آخرت کی ہے۔ اس دنیا کے لیے بہت زیادہ وعدہ نہیں کیا گیا ہے کہ آپ نیک اعمال کریں گے تو آپ کو اتنی راحت ملے گی، آپ کو اتنا پیسہ مل جائے گا، آپ کو اتنی تنخواہ مل جائے گی۔ اس کا کوئی وعدہ یہاں نہیں کیا گیا ہے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ جب میری مدرسی کا ابتدائی دور تھا، میں ایک اسٹیشن پر بیٹھا تھا اور دو تین طلبہ بھی بیٹھے تھے۔ رات کا وقت تھا، بالکل سناٹا تھا، اسٹیشن ماسٹر بھی ہمارے پاس آکر بیٹھ گیا اور پوچھا کہ 'مولوی صاحب! کیا کرتے ہیں؟ پڑھاتے ہیں؟' ہم نے کہا 'ہاں پڑھاتے ہیں۔' اس کی سمجھ میں نہیں آیا تو کہا کہ 'گورنمنٹ کی ملازمت کرتے ہیں؟' تو میں نے کہا 'ہاں بڑی گورنمنٹ کی ملازمت کرتے ہیں۔' کہا کہ 'بڑی گورنمنٹ کا کیا مطلب؟ سینٹرل کی؟' میں نے کہا 'سینٹرل سے بھی اوپر ایک گورنمنٹ ہے، اس کی ملازمت کرتے ہیں۔' وہ چکرایا کہ اس سے اوپر کون سی گورنمنٹ ہے؟ ہم نے کہا 'اس سے اوپر گورنمنٹ اللہ تعالی کی ہے۔' اس نے کہا 'اس کی تنخواہ کیا ہوتی ہے؟ ہم نے کہا 'اس کی تنخواہ ہمیں نہیں معلوم، اس کی تنخواہ بعد

میں ملے گی۔‘

اس دنیا میں آدمی اسی پیمانہ سے ناپتا ہے کہ کتنا پاتا ہے؟ کس کی تنخواہ کتنی ہے؟ بس اسی میں رہتا ہے، مگر پیغمبروں نے یہ بشارت دنیا میں نہیں سنائی ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی جتنی بشارتیں ہیں سب کا تعلق آخرت سے ہے۔ یہ عمل کروگے تو جنت میں جاؤگے، یہ کام کروگے تو جنت میں درجات بلند ہوں گے۔ چنانچہ اگر کسی صاحبِ حق نے نزاع چھوڑنے کے لیے اور نزاع سے بچنے کے لیے اپنا حق چھوڑ دیا تو اللہ کے رسول ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ ’اس کو جنت میں گھر ملے گا۔‘ گویا ساری بشارتوں کا تعلق آخرت سے ہے۔

دنیا بشارت کا محل ہے ہی نہیں:

یہ دنیا دارالعمل ہے دارالجزا نہیں ہے، یہ دنیا بشارت کا محل ہے ہی نہیں، کبھی دنیا میں کوئی آدمی پورے طور سے راحت اور آرام کے ساتھ رہنا چاہے تو نہیں رہ سکتا، دل کو تکلیف پہنچے گی، جسم کو تکلیف پہنچے گی، دماغ کو تکلیف پہنچے گی، مال میں کمی آئے گی، سب کچھ ہوتا رہے گا۔ ہاں آدمی کے آرام کی ایک ہی صورت ہے کہ اپنے آپ کو پورے طور پر اللہ سے وابستہ کرلے تب تو راحت ملے گی۔ جب دل اللہ کے ساتھ وابستہ ہوگا تو تکلیفوں کا احساس نہیں ہوگا، خدا تعالی کو دیکھ کر خوش رہے گا۔ یہ دنیا دارالاحزان ہے۔ اللہ نے ارشاد فرمایا: وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِیٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ۔ [فاطر: ۳۴] تمام تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہمارا رنج وغم دور کردیا۔ بلاشبہ ہمارا رب بہت معاف کرنے والا قدرداں ہے۔

رسول اللہ ﷺ دنیا میں مبشر بن کر تشریف لائے، اور آپ کی بشارت اس دنیا کے لیے نہیں تھی، بلکہ آخرت کے لیے تھی۔ یہاں دنیا میں تو عمل کرنا ہی ہے، یہاں تو بظاہر مشقتیں اٹھانی ہی ہیں، خود جناب نبی کریم ﷺ کی زندگی کا کوئی دن ایسا نہیں ہے جو مشقت سے بھرا ہوا نہ ہو۔ آخری وقت میں غزوہ تبوک اتنا لمبا سفر کرنا پڑا، وہ بھی مشقت

سے بھرا ہوا تھا، اور جس وقت آپ دنیا سے تشریف لے جا رہے تھے، اس وقت آپ کو کرب تھا، بے چینی تھی، بار بار پانی میں ہاتھ ڈال رہے تھے، چہرے پر لے جاتے تھے، سینے پر لے جاتے تھے، بخار شدید تھا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حاضر ہوئیں، انھوں نے دیکھا تو ابا کی تکلیف دیکھی نہیں گئی۔ آپ نے آنکھ کھول دی اور فرمایا 'بیٹی! آج کے بعد تمھارے باپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔' دنیا کا آخری دن ہے اور آپ تکلیف اٹھا رہے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ 'بیٹی! آج کے بعد تمھارے باپ کو کوئی تکلیف نہیں ہے۔'

شیخ عبدالقدوس گنگوہی کا یقین:

یہ ساری بشارتیں وہاں کے لیے ہے، دنیا کے لیے نہیں ہیں۔ اہل ایمان کو اپنا ایمان آخرت پر مضبوط کرنا چاہیے۔ ہم لوگوں کو بس یہ چاہیے کہ دنیا کی بشارت مل جائے۔ میں نے شیخ عبدالقدوس گنگوہی کا واقعہ عرض کیا تھا کہ 'وہ ذکر میں، عبادت میں لگے رہتے تھے، گھر میں فاقہ ہوتا تھا۔ ایک دن ان کی بیوی نے کہا کہ 'آپ تو گھر ہی پر پڑے رہتے ہیں، نہ کہیں آتے جاتے ہیں اور نہ ہی کماتے ہیں، یہاں فاقہ ہو رہا ہے، جائیے! کچھ کمائیے۔' تو شیخ نے فرمایا کہ 'نیک بخت! آرام سے رہو، یہ جو تھوڑی سی تکلیف دیکھ رہی ہو، برداشت کرو، ہمارے لیے بہت اچھے اچھے پکوان تیار ہو رہے ہیں۔' انھوں نے پوچھا 'کہاں؟' کہا 'آخرت میں، اللہ کے یہاں جنت میں۔' ان کی بیوی بڑی نیک بخت تھیں، کہتی ہیں کہ 'ٹھیک ہے، اچھی بات ہے۔' ہم لوگوں کی بیویاں ہوتیں تو اللہ جانے کتنا ہنگامہ ہوتا، یہاں دنیا میں جان نکل رہی ہے یہ جنت کی لیے بیٹھے ہیں۔

آخرت کی بشارتیں رسول اللہ ﷺ کی چشم دید ہیں:

میں عرض کر رہا تھا کہ پیغمبر کی بشارتیں اس دنیا کے لیے نہیں تھیں، آخرت کے لئے ہیں، اور یہ آخرت کی بشارت جو آپ نے دی ہیں، اس طور سے دی ہیں کہ ان نعمتوں کو خود آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے،، کہیں شک کی گنجائش نہیں ہے۔ ایک خاتون تھیں جن کا بیٹا غزوۂ احد میں شہید ہو گیا تھا۔ فریاد کر رہی تھیں، غمزدہ تھیں، آنکھوں سے

آنسو جاری تھے۔ حضرت نے ان سے ارشاد فرمایا کہ 'تم غمزدہ ہو، تمھارا بیٹا جنت میں ہے، تسلی رکھو، بلکہ انھوں نے کہا تھا کہ 'حضرت! مجھے بتا دیجیے کہ میرا بیٹا کہاں ہے؟ اگر جنت میں ہے تو ٹھیک ہے، اور اگر کسی اور طرف ہے تو میں ایسا روؤں گی، ایسا روؤں گی کہ دنیا دیکھی گی۔' تو حضرت نے فرمایا کہ 'تمھارا بیٹا جنت میں ہے، اگر تم کہو تو میں تمھیں جنت دکھا دوں۔' انھوں نے کہا 'حضرت! آپ کے بتانے سے مجھے یقین ہے، مجھے اطمینان ہوگیا کہ میرا بیٹا جنت میں ہے۔' آخرت پر ایسا ایمان، ایسا یقین چاہیے۔

حضور ﷺ نے آخرت کو بچشم خود دیکھا ہے۔ معراج میں لے جائے گئے تو اللہ نے آپ کو جنت اور جہنم کی سیر کرائی، اور آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بشارت سنائی کہ 'ایسا کروگے تو تمھارے لیے جنت ہے، ایسا کروگے تو جہنم ہے۔' آدمی کو اگر اس پر یقین آجائے کہ ہمارے لیے جنت ہے تو بڑے سے بڑا ظاہری نقصان اٹھانا بھی سہل ہو جائے۔

رسول اللہ ﷺ دونوں جہاں کے باسی تھے:

اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر علیہ السلام صرف اِس دنیا کے انسان نہیں تھے، اُس دنیا کے بھی انسان تھے۔ اس رہتی زندگی میں جہاں وہ اس دنیا میں تھے، وہیں وہ آخرت والی دنیا میں بھی تھے۔ معراج میں آپ ﷺ کا جانا سب کا سب اِس دنیا کا کام تھا، اسی وجہ سے علما کا اختلاف ہوتا ہے کہ 'پیغمبر علیہ السلام نے اللہ کی زیارت کی ہے یا نہیں؟' بہت سے علما کہتے ہیں انھیں میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی ہیں کہ 'آپ نے اللہ کی زیارت نہیں کی ہے، وہ آخرت کی چیز ہے۔' دوسری طرف صحابہ کرام کا ایک بڑا طبقہ ہے اور علما کا بھی کہ 'آپ نے اللہ کی زیارت کی تھی۔'

ہمارے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کہتے تھے کہ راجح یہی ہے کہ آپ نے اللہ کی زیارت کی تھی۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں اللہ کو دیکھنا محال ہے۔ حضرت موسی علیہ السلام نے اللہ کو دیکھنا چاہا اور درخواست پیش کی کہ 'میں آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں تو اللہ

نے فرمایا 'لَنْ تَرَانِیْ' [الاعراف:۱۴۳] تم مجھے نہیں دیکھ سکتے، مگر ان کا سوال دنیا میں تھا، کوہِ طور پر تھا، اور رسول ﷺ نے اللہ کو معراج میں دیکھا ہے، اس دنیا سے نکل کر آخرت کی دنیا میں دیکھا ہے، اور آخرت میں پہنچنے کے بعد انسان کو وہ طاقت ملے گی، اس کی نگاہ کو وہ قوت ملے گی کہ اللہ تعالی کی زیارت کر لے گا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اللہ کی زیارت اسی دنیا میں کی ہے، اور آپ اسی حیات کے ساتھ، اسی زندگی کے ساتھ اِس دنیا میں بھی تھے اور اُس دنیا میں بھی تھے۔ یہاں لوگوں کے درمیان رہے ہیں اور اللہ کو منظور ہوا تو آسمان پر لے جائے گئے، اور تمام آسمان کی سیر کرائی گئی، جنت، دوزخ کی سیر کرائی گئی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کی عظمت کیا کچھ ہوگی! کہاں تک آپ کا مقام ہے! کوئی اندازہ نہیں کرسکتا، اللہ ہی بتا سکتے ہیں۔

حیات طیبہ کا مفہوم:

بہر حال! آپ مبشر ہیں، آخرت کی بشارت دیتے ہیں، دنیا میں تو کام کا حکم دیتے ہیں کہ یہ کام کرو، یہ کام مت کرو۔ ویسے دنیا کے لیے بھی بشارت ہے اگر آدمی واقعی اخلاص کے ساتھ اللہ کے لیے اپنے آپ کو اللہ کے احکام کے سپرد کر دے تو خود اللہ نے وعدہ کیا ہے: مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيٰوةً طَيِّبَةً۔ [النحل:۹۷] جو شخص عمل صالح کرتا ہے خواہ مرد ہو یا عورت ہو، اور وہ ایمان والا ہے تو ہم اس کو حیات طیبہ عطا فرمائیں گے۔ علما نے فرمایا ہے کہ حیات طیبہ سے مراد جنت کی زندگی ہے، دنیا کی زندگی نہیں ہے، لیکن قرآن کی آیت مطلق ہے جس کے اندر ایمان اور عمل صالح ہوگا تو چاہے وہ مرد ہو یا عورت، اس کو حیات طیب نصیب ہوگی۔ اس سے بظاہر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ صرف جنت ہی کی بات نہیں ہے، دنیا کی بھی بات ہے۔ ہم اس کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں کہ واقعی جن لوگوں نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا اور وہ ہر چیز میں اللہ کی رضا جوئی دیکھتے ہیں تو دنیا کی تکلیفیں ان کے اوپر آتی ہیں، مگر ایسے واپس چلی جاتی ہیں جیسے پہاڑ سے ہوا ٹکرا کر واپس چلی جاتی ہے۔

یقین کا کمال:

ایک بزرگ مفتی محمد حسن صاحب امرتسری تھے، عالم بھی بڑے تھے، ان کا پاؤں کاٹا جا رہا تھا، بے ہوش کرنے کے لیے کلوروفارم سنگھاتے ہیں، انھیں ڈاکٹر نے سنگھانے کی کوشش کی تو کہا 'نہیں! اس کی ضرورت نہیں ہے، مجھے بے ہوش مت کرو، ہوش وحواس میں میرا آپریشن کر دو۔' ڈاکٹر نے کہا 'بہت تکلیف ہوگی۔' انھوں نے کہا 'کچھ بھی ہو۔' ڈاکٹروں کو ہمت نہیں ہو رہی تھی، کیسے کرتے، مگر بہرحال جب انھوں نے اصرار کیا تو مان گئے۔ ہاتھ میں تسبیح لی اور نیم دراز لیٹ گئے اور پاؤں ڈاکٹروں کے حوالہ کر دیا۔ تسبیح پڑھتے رہے اور ڈاکٹر پاؤں کاٹتے رہے، آپریشن میں ڈھائی گھنٹے لگے تھے۔ آج تو بہت ترقی یافتہ دور ہے، ایسا دور نہیں تھا، میڈیکل سائنس بہت پیچھے تھی، پاؤں کٹ گیا مگر اُف تک نہیں کہا، چہرے پر کوئی تغیر نہیں آیا، ماتھے پر شکن تک نہیں آئی۔ بعد میں کہنے والوں نے کہا 'حضرت! اتنا بڑا اور تکلیف دہ آپریشن ہوا اور آپ پر کوئی اثر نہیں ہوا؟ کیا بات ہے؟' فرمایا 'تکلیف تو ہوئی تھی لیکن اس پر جو اجر مجھے اللہ کے یہاں ملنے والا ہے، اس اجر کو اللہ نے میرے سامنے کر دیا، جس کو دیکھنے میں میں ایسا محو ہوا کہ اِدھر کیا ہو رہا ہے، مجھے کچھ خبر ہی نہیں رہی۔' جب ایمان کی فراوانی ہوتی ہے اور یقین کی کثرت ہوتی ہے تو اللہ تعالی اسے دنیا میں ہی اس کا اجر وبدل دکھا دیتے ہیں۔

سید احمد شہید کے قافلے میں ایک صاحب چراغ علی تھے، جہاد شروع ہو گیا اور وہ کھچڑی پکا رہے تھے، اچانک ان کی نگاہ سامنے اٹھی اور کہا 'ارے! میں کھچڑی پکا رہا ہوں اور سامنے حوریں میرا انتظار کر رہی ہیں۔' چھوڑ دیا اور بندوق لے کر میدان میں آ گئے، اور تھوڑی دیر کے بعد شہید ہو گئے۔

انسان کا یقین جس قدر آخرت پر ہوگا، اس کا عمل اتنا ہی قوی ہوگا، ورنہ آدمی پریشان رہتا ہے۔ میں نے ایک بزرگ کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، بے انتہا کمزوری اور ضعف کی وجہ سے لوگ ان کو ٹانگ کر لے جا رہے ہیں، خود سے چل نہیں سکتے

تھے، لیکن انھیں جمعہ کے دن پہلی صف میں لا کر کھڑا کر دیا گیا، نیت باندھ لی اور پکڑ نے والے ہٹ گئے، بڑے اطمینان سے چار رکعت نماز ادا کی، رکوع کیا، سجدہ کیا اور بیٹھے بھی۔ کوئی بھی ان کو سہارا دینے والا نہیں تھا، اور میرے اندازے کے مطابق انھوں نے صلوۃ التسبیح پڑھی تھی، مگر جب انھوں نے سلام پھیرا تو لوگ جلدی سے آگے بڑھے اور سہارا دیا۔ معلوم ہوا کہ ان کا یہی حال ہے۔ اللہ کے وعدوں پر اتنا یقین ہوتا ہے کہ جیسے ہی اُدھر متوجہ ہوتے ہیں، قوت پیدا ہو جاتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ مبشر تھے، آپ نے تکلیفیں بہت اٹھائی ہیں، لیکن کبھی آپ کے زبان مبارک پر کوئی شکایت کا لفظ نہیں آیا ہے، اس لیے کہ آپ اجر و بدل کو دیکھتے تھے۔ آج ہم تکلیفوں پر شکایتیں کرتے ہیں، اس لیے کہ ہم کو احساس ہے کہ ہم کو کچھ ملنے والا نہیں ہے۔ کسان بہت محنت کرتا ہے مگر شکایت نہیں کرتا ہے، راتوں کو جاگتا ہے، پانی چلاتا ہے، کوئی شکایت نہیں کرتا ہے، اس لیے کہ اس کو غلہ ملے گا۔ حضور ﷺ نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اس کے بعد بشارت دی ہے، اور ان بشارتوں پر جن کو یقین ہوا ہے، انھوں نے مشکل سے مشکل کام کر ڈالے ہیں، جن کے کرنے کا آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

آدمی کو اپنا عمل ٹھیک کرنا چاہیے، مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ عمل ٹھیک ہو تو مصیبت نہ آئے، اس لیے کہ اعمال ٹھیک کر لینے کے بعد وعدہ نہیں ہے کہ کوئی مصیبت نہیں آئے گی۔ اعمال ٹھیک ہوں گے اور بندے کا یقین آخرت پر مضبوط ہوگا تو ان مصیبتوں پر بندہ خوش ہوگا۔

مصیبت تین طرح کی ہوتی ہے:

سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی فرماتے ہیں کہ مصیبت تین طرح کی ہوتی ہے: ایک مصیبت درجات کو بلند کرنے کے لیے آتی ہے، ایک مصیبت گناہوں کا کفارہ بن کر آتی ہے، ایک مصیبت عذاب ہوتی ہے۔ جس مصیبت پر آدمی دل و جان سے قربان ہوتا

ہے کہ اللہ کی طرف سے آئی ہے، تو وہ مصیبت بلندیِ درجات کا سبب ہوتی ہے، اور جس مصیبت پر آدمی صبر کرے اور بالکل شکایت نہ کرے، تو اس مصیبت سے گناہ معاف ہوتے ہیں، اور جس مصیبت پر آدمی جزع فزع کرتا ہے، گھبراتا ہے، پریشان ہوتا ہے، تو یہ مصیبت اس کے گناہوں کی سزا ہے۔

خلاصہ یہ کہ مسلمان کے شایانِ شان یہ نہیں ہے کہ بہت زیادہ ہائے ہائے کرے بلکہ رسول اللہ ﷺ کی بشارت پر اپنا یقین مضبوط کرے۔

اگر دنیا میں مصیبت آرہی ہے تو بشارت ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ 'مومن کے اوپر تکلیف آتی ہے، تو وہ کچھ نہ کچھ دے کر جاتی ہے۔' جیسے سیلاب آتا ہے تو کچھ نہ کچھ دے کر جاتا ہے، تو تکلیف ایمان والوں کو کچھ دے کر جاتی ہے، مگر ایمان والا ہی اپنے ایمان کے تقاضے کو چھوڑ دیتا ہے اور سزا کا مستحق ہوجاتا ہے۔

تیسری صفت 'نذیر':

'ونذیرا' اور ڈرانے والے ہیں۔ دنیا کے ڈرانے والے نہیں کہ یہ ہوجائے گا وہ ہوجائے گا، بلکہ آخرت کے ڈرانے والے ہیں۔ یہ بتانے والے ہیں کہ کس عمل سے مستقبل یعنی آخرت تباہ ہوجائی گی، جنت چھن جائے گی، جہنم مقدر ہوجائے گی، قبر کا عذاب ہوگا۔

چوتھی صفت 'داعی الی اللہ':

'وَدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ' اللہ کے حکم سے اللہ کی طرف سب کو بلاتے ہیں۔ اسی کی دعوت دیتے ہیں۔ اللہ کی طرف بلانا بہت مشکل کام ہے، کیوں کہ یہ غیب کی دعوت ہے، کون سنے گا؟ جب تک اللہ کے حکم سے اس کی مدد نہیں ہوگی، آدمی اس میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اللہ کی طرف دعوت دینے کے لیے اللہ بندوں کا انتخاب فرماتے ہیں اور ان کی تربیت کرتے ہیں تو وہ اللہ کی طرف بلاتے ہیں، ورنہ آدمی بجائے اللہ کی طرف بلانے کے اپنی پارٹی کی طرف بلانے لگتا ہے، اپنے کو منوانے لگتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ جو داعی

ہیں وہ اللہ کی طرف داعی ہیں، اللہ کے حکم سے ہیں۔

پانچویں صفت 'سراج منیر':

پانچویں صفت بیان کی 'وسراجا منیرا' روشن چراغ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو روشن چراغ سے تشبیہ دی ہے، حالاں کہ آپ تو آفتاب ہیں، آفتاب سے تشبیہ دیتے، روشن چراغ سے کیوں دی؟ اس کی توجیہ علما نے یہ کی ہے کہ آفتاب کی روشنی ہمارے قابو میں نہیں رہتی، جیسے چاہیں ہم اُس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے، اس کے قریب نہیں جا سکتے، جب کہ چراغ کے قریب جایا جا سکتا ہے، جیسے چاہیں ہم اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی شان آفتاب جیسی نہیں ہے کہ اس کے قریب کوئی پہنچ ہی نہ سکے، بلکہ آپ کی شان چراغ سی ہے، ہر ایک اس سے قریب سے استفادہ کر سکتا ہے، ایسے ہی آپ کی ذات سے ہر ایک استفادہ کر سکتا ہے، معمولی سے معمولی آدمی آپ کے قریب پہنچ سکتا ہے۔

لیکن ہم کہتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ یہ سراج آفتاب ہی ہو، اللہ تعالی نے سورہ نوح میں فرمایا ہے: وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا۔ [۱۶] اللہ نے سورج کو چراغ بنایا۔ یہ سورج بھی چراغ ہی ہے، ایک بڑا چراغ۔ حضور ﷺ کی ذات ایسی ہے جیسے آفتاب کی روشنی، جو ہر طرف پھیلی ہوئی ہے، اسی طرح حضور ﷺ کی روشنی بھی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ آپ ظاہری اعتبار سے عرب میں طلوع ہوئے، لیکن دیکھیے کہ آپ کی روشنی کہاں تک پھیلی ہوئی ہے، دنیا کے ہر حصہ، ہر خطہ، ہر سرزمین پر آپ کی روشنی پھیلی ہے۔

پھر فرماتے ہیں کہ جب آپ کی پانچ حیثیتیں ہیں تو مومنین کو بشارت دیجیے ان کو خوش خبری سنائیے کہ: بِأَنَّ لَهُمْ مِنَ اللهِ فَضْلًا كَبِيرًا۔ ان کے لیے اللہ کی طرف سے بڑا فضل ہے، بڑی مہربانی ہے، مگر صرف ان کے لیے جو صاحبِ ایمان ہیں۔ مہربانی کا مستحق ایمان والا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ دنیا اور آخرت دونوں جگہ صاحبِ ایمان مہربانی کا مستحق ہے: دنیا میں اس لیے کہ اس کو طاعت کی توفیق ملے گی، نیکیوں کی توفیق ملے گی،

اس کے موافق لوگ ملیں گے، اس سے محبت کرنے والے لوگ ملیں گے، اسی کی دعا کرائی گئی ہے: رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا۔ اے ہمارے پروردگار! ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کو ہماری آنکھ کے لیے ٹھنڈک بنادے، اتنی محبت والے ہوں، اتنے اچھے ہوں، اتنے فرماں بردار ہوں کہ ان کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہوجائے۔ یہ دنیا کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اور: وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا۔ [الفرقان: ۷۴] ہم کو متقیوں کا پیشوا بنادے۔ یعنی جتنی ہماری اولاد ہوں، سب متقی اور پرہیزگار ہوں، آپ کی اطاعت گزار اور فرماں بردار ہوں۔

فضلِ کبیر کیا ہے؟:

فضل کبیر کی اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بشارت دی ہے۔ فضل کبیر یہ ہے کہ دنیا میں اللہ کی اطاعت کی توفیق ملتی رہے، اور جو لوگ اِرد گرد ہوں، سب محبت کرنے والے ہوں، سچا تعلق رکھنے والے ہوں، سچے ہمدرد و بہی خواہ ہوں، ورنہ تو آدمی کی مصیبت تو گھر میں پڑی ہوئی ہوتی ہے۔

اور پھر فرماتے ہیں وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنَافِقِيْنَ اور کافروں اور منافقوں کی اطاعت مت کرو، ان کے راستے پر مت چلو، اگرچہ بظاہر ان کی اطاعت نہ کرنے میں نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ وَدَعْ اَذَاهُمْ اور چھوڑ دو ان کا ستانا۔ اللہ پر بھروسہ کرو: وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ۔ اللہ کی اطاعت پر آؤ، اپنی زندگی کا ہر گوشہ اللہ کی اطاعت میں گزارو، اندر کا بھی باہر کا بھی، اپنے تعلقات میں بھی سب جگہ اللہ کا حکم نافذ کرو، اللہ کے حکم پر آؤ گے تو اتنی مشغولیت ہوجائے گی کہ دوسرا کام کرنے کی نوبت ہی نہ آئے گی۔ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا۔ اور اللہ تعالیٰ کافی ہیں کام بنانے کے اعتبار سے۔ مطلب یہ کہ جس وقت اللہ کا جیسا حکم ہو، ویسا کریں، اپنے سے فیصلہ نہ کریں۔

صرف اطاعت اللہ کے لیے ہوتی ہے:

ایک مرتبہ ایک مسجد میں ہم گئے تو لوگ بہت شور کر رہے تھے۔ میں نے کہا

’بھائیو! اللہ کی مسجد ہے، اتنا شور مت کیجیے۔‘ تو ان میں سے ایک صاحب نے کہا: ’ہم اللہ ہی کے واسطے اِتنا شور کرتے ہیں، اللہ نے بس یہی حکم دیا ہے کہ مسجد میں چلاؤ۔‘ ہم چپ ہو گئے، ہم کو تو اللہ کے واسطے چپ ہونا تھا۔ عشا کی نماز کے بعد ہم نے کہا ’کچھ دیر ٹھہر جائیں، ہم کچھ بات کریں گے۔‘ سب ٹھہر گئے، وہ چلا گیا جو کہہ رہا تھا کہ اللہ کا حکم ہے شور کرنے کا۔ میں نے کہا وہ تو چلے گئے، لیکن میں بتا دوں کبھی مسجد میں شور اللہ کے واسطے نہیں ہوا کرتا، کچھ کام ایسے ہیں جو فی نفسہ گناہ ہیں، گناہ کے کام کبھی اللہ کے واسطے نہیں ہو سکتے۔ آدمی سود لے اور کہے کہ میں اللہ کے واسطے لیتا ہوں تو کافر ہو جائے گا، اور شراب پیے اور کہے کہ شراب کے علاوہ کوئی ایسی چیز نہیں جو طبیعت میں بشاشت پیدا کر سکے، تو کافر ہو جائے گا۔ کسی گناہ کے بارے میں کہے کہ میں اللہ کے لیے کرتا ہوں تو غلط ہے، ہمیشہ عبادت اللہ کے لیے ہوتی ہے، مباح کام اللہ کے ہوتا ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

❑❑❑

درسِ قرآن

[جامع مسجد شہر اعظم گڑھ]

رسول اللہ ﷺ کی خصوصیات
اور
ایقاعِ طلاق میں در آنے غلطیوں کی اصلاح

الحمدلله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله وصحبه اجمعين۔

اَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿٤٩﴾ [الاحزاب]

اے مومنو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو، پھر ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دیدو تو ان پر تمھارا کوئی حق عدت کا نہیں جسے تم شمار کرو۔ پس تم کچھ نہ کچھ انھیں دیدو اور بھلے طریق پر انھیں رخصت کردو۔

اس آیت میں اللہ نے ایک مسئلہ بیان کیا ہے۔اس سے پہلے نبی ﷺ کے اوصاف وکمالات کا بیان چل رہا تھا۔وہ خاص مسئلہ نبی ﷺ کی ازواج مطہرات کا ہے۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ حضور کے نکاح میں چار سے زائد بیویاں تھیں۔ عام امت کو صرف چار نکاح کی اجازت ہے: فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَ رُبٰعَ۔ [النساء:۳] نکاح کروان عورتوں سے جو تمھیں پسند آئیں دو دو سے، تین تین سے اور چار چار سے۔

قانونِ نکاح کی حیثیت وضرورت:

نکاح انسان کی بنیادی ضروریات میں سے ہے، نسل کی بقا کے لیے بھی اور گھریلو راحت کے لیے بھی۔ آدمی کو اس سے تسکین ملتی ہے۔ جیسے کھانا ضروری ہے، ایسے ہی نکاح بھی ضروری ہے۔ آدمی میں اللہ تعالی نے جو خاص چیزیں رکھی ہیں جن میں وہ مجبور ہے، اُن میں جہاں بھوک اور پیاس ہے، وہیں ایک چیز جنسی خواہش اور شہوت ہے۔ اللہ نے جیسے ہر مسئلہ کا حل نکالا ہے، ویسے ہی اس مسئلہ کا بھی حل بتایا ہے۔ یہ ضرورت کی چیز ہے، اگر یہ نہ ہو تو نسل انسانی کی بقا ممکن نہیں۔ اللہ نے فیصلہ فرمایا کہ قیامت تک آدم علیہ السلام کی نسل باقی رہے، تو اس کے لیے بنیادی ضرورت نکاح ہے۔ اور نکاح کا تقاضہ ہر انسان کے اندر ہوتا ہے چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ اللہ نے انسان کے اس تقاضے کے صحیح استعمال کا ایک قانون بنا دیا۔ اگر اس کے صحیح استعمال کا جذبہ نہ ہوتا تو نہ جانے انسان کتنی برائیوں میں ملوث ہوتا۔ قانون اسی لیے بنتا ہے کہ سب لوگ بھلے طریقے سے رہ سکیں۔ ساری دنیا کے قوانین اسی لیے ہیں۔ اور اللہ نے جب انسان کی فطرت کو دیکھتے ہوئے قانون بنایا تو اس میں ساری دنیا کا امن بھی ہے اور خود انسانیت کے تقاضوں کی تکمیل بھی ہے۔ ورنہ اگر پانی یونہی چھوڑ دیا جائے تو اِدھر اُدھر بہہ کر سب کو خراب کر دے گا، اور صحیح راستہ پر لگا دیا جائے تو قاعدے سے استعمال ہوتا رہتا ہے۔ یہی حال انسان کی طاقت کا ہے کہ اگر ٹھیک سے استعمال ہو تو بہت کار آمد ہے اور اگر غلط استعمال ہو تو سیلاب کے پانی کی طرح سے آبادی کی آبادی ڈوب جائے۔

اللہ تعالی نے عام انسانوں کو اجازت دی ہے کہ بیک وقت وہ چار نکاح کر سکتا

ہے، مگر اس کے لیے اللہ نے کچھ پابندیاں لگائی ہیں۔ظاہر سی بات ہے نکاح میں جب چار عورتیں ہوں گی تو کشمکش، آپسی چپقلش، کشیدگی سب چلے گا، اس کا بھی حل اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ ان میں عدل ضروری ہے۔ اور جہاں انصاف ہوتا ہے، وہاں ایسی کوئی خرابی نہیں پیدا ہوتی کہ آدمی کے لیے نا قابل برداشت ہو جائے۔

رسول اللہ ﷺ کا کمالِ ضبط:

پیغمبر علیہ السلام کا معاملہ امت سے الگ ہے، اللہ کی طرف سے انھیں بہت سے معاملات میں خصوصیات عطا ہوئی ہیں، بلکہ اتنی زیادہ خصوصیات عطا ہوئی ہیں کہ کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ آپ اس قبیلہ سے الگ ہیں۔ آدمی جن چیزوں میں پریشان ہو جاتا ہے، جن کا ضبط کرنا مشکل ہوتا ہے، حضور ﷺ کو آپ دیکھیں گے کہ آپ بہت معمولی انداز میں اس کو جھیل جاتے ہیں۔ چند تقاضے انسانوں کے ایسے ہیں جن پر کوئی روک نہیں لگائی جاسکتی: ان میں ایک تقاضا بھوک کا ہے، ایک پیاس کا ہے، ایسے ہی نیند کا ایک تقاضا ہے، ان کے علاوہ انسان کی لذتوں کے بہت سے تقاضے ہیں۔ آدمی ان کو برداشت نہیں کر پاتا، مگر ہم رسول اللہ ﷺ کو ہر تقاضے میں دیکھتے ہیں کہ آپ نے ان کو اس طرح سے ضبط کیا کہ بعض مرتبہ احساس ہوتا ہے یہ تقاضا آپ میں موجود ہی نہیں تھا۔ مثلاً سونے ہی کا تقاضا ہے، ہر انسان جانتا ہے کہ انسان کو صحت کی بہتری کے لیے اتنے گھنٹے سونا چاہیے، اتنا کھانا چاہیے۔ ہم رسول اللہ ﷺ کو نبوت کے بعد سے وفات کی عمر تک دیکھتے ہیں، کبھی بھی آپ کو گہری نیند سوتے ہوئے نہیں پایا، اور کبھی ایسا نہیں ہوا ہے کہ پوری رات ایک نیند سوئے ہوں، رات کو دیر میں سوئے ہوں یا جلدی، آپ کا معمول سویرے اٹھنے کا تھا۔ حدیث سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ رات میں ایک مرتبہ نہیں، بار بار اٹھتے تھے۔ یہ تو آسان ہے کہ آدمی عشا بعد سو گیا اور تین چار گھنٹہ مسلسل سویا رہا، پھر اس کے بعد اٹھ گیا، لیکن تھوڑی دیر سویا پھر اٹھا اور کام میں لگ گیا، پھر سو گیا، پھر تھوڑی دیر بعد اٹھ کر کام وغیرہ کر کے سو گیا۔ رات کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے کچھ دیر سوئے کچھ دیر کام کرے، یہ

ایک مشکل ترین عمل ہے۔ جو عام طور سے ایک دو دن تو انسان برداشت کرسکتا ہے لیکن اس سے زیادہ برداشت نہیں کرسکتا۔ مگر رسول اللہ ﷺ کو ہم دیکھتے ہیں کہ روزانہ کا یہ دستور تھا، شروع رات میں ازواج میں سے کسی کے پاس گئے، کچھ دیر لیٹے، پھر فرمایا مجھے چھوڑو، نماز پڑھنا ہے۔ نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے، پھر کچھ دیر بعد آکر لیٹ گئے، بلکہ سو گئے، خراٹے بھی ہلکے ہلکے آنے لگے، لیکن پھر تھوڑی ہی دیر میں آپ اٹھ گئے، نماز پڑھنے لگے، پھر کچھ دیر بعد سو گئے۔

حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی رات دیکھنی چاہی کہ آپ کی رات کس طور سے گذرتی ہے، تو میں اپنی خالہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے اجازت چاہی کہ میں آج رات آپ کے یہاں رہوں گا اور یہ دیکھوں گا کہ حضور ﷺ کی رات کیسے گذرتی ہے؟ انھوں نے اجازت دے دی اور میں ایک گوشے میں جا کر پڑ گیا۔ رسول اللہ ﷺ عشا کے بعد تشریف لائے اور کچھ پڑھ کر سو گئے۔ کچھ ہی دیر کے بعد دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اٹھے، مسواک کی، وضو کیا اور نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ میں بھی اٹھا اور آپ کی بائیں جانب کھڑا ہو گیا، حضور کو احساس ہو گیا کہ میں کھڑا ہوں تو آپ نے میرا کان پکڑا اور مجھے دائیں جانب کر دیا۔ [یہ ہمیشہ کے لیے سنت بن گئی کہ اگر ایک امام اور ایک مقتدی ہو تو مقتدی امام کی دائیں طرف کھڑا ہوگا] آپ نے دو رکعت نماز پڑھی اور آکر لیٹ گئے اور سو گئے، کچھ ہی وقت گذرا ہوگا کہ اٹھ کر پھر نماز پڑھنے لگے۔ اس طرح ہر دو رکعت کے بعد سوتے تھے اور کچھ دیر میں اٹھ جاتے تھے اور نماز شروع کر دیتے تھے۔ روایت میں آتا ہے کہ رات گذرتے گذرتے آپ نے بارہ رکعتیں پڑھیں اور آخری رات کا حصہ آیا تو آپ نے وتر پڑھی، پھر لیٹ گئے۔ پھر جب فجر کی نماز کا وقت ہوا تو ہلکی سی دو رکعتیں پڑھیں اور فجر کی نماز پڑھائی۔ [ابوداؤد: ۱۳۶۷]

اب آپ بتائیے کہ رات جاگنے میں گذری یا سونے میں گذری؟ بلکہ یہ کہیے کہ

پوری رات آپ جاگے۔ یہ بہت مشکل کام ہے، لیکن آپ کا معاملہ بالکل الگ ہے۔ نہ آپ صبح کسی سے شکایت کرتے کہ مجھے بہت نیند آرہی ہے، نہ ہی کسی روایت میں یہ ملتا ہے کہ آپ صبح کی نماز کے بعد رات بھر جاگنے کی وجہ سے سو گئے۔ ہاں آپ دوپہر میں تھوڑا آرام کرتے تھے۔ یہ حالت دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے سونے اور جاگنے کا جو تقاضا عام طور سے انسان کو دبائے رہتا ہے، آپ کو اس کا تقاضا ہی نہیں تھا۔

کھانا نہ کھانے کا عالم یہ ہوتا تھا کہ دو دو مہینہ گھر میں چولھا نہیں جلتا تھا۔ کہیں نہیں ملتا ہے کہ آپ نے کسی صحابی سے کہا ہو کہ 'آج میں نے کھانا نہیں کھایا۔' وہ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھانجے حضرت عروہ سے بتا دیا تھا کہ 'دو مہینہ سے گھر میں چولھا نہیں جلتا تھا۔ انھوں نے پوچھا کہ 'گذر کیسے ہوتا تھا؟' تو کہتی ہیں 'بس کھجور پانی سے۔' ازواج مطہرات کا بھی کمال ہی تھا کہ وہ کسی سے شکایتاً نہیں کہتی تھیں۔ بھوک کی وجہ سے کبھی کبھی آپ کے پیٹ پر پتھر بندھتا تھا۔ خندق کے موقع پر ایک صحابی نے اپنا پیٹ آپ کو دکھایا کہ 'ایک پتھر بندھا ہوا ہے۔' آپ نے اپنا دامن مبارک اٹھایا تو دو دو پتھر بندھے ہوئے تھے، مگر کبھی کسی کو احساس نہیں ہوتا تھا کہ آپ اس پریشانی اور مصیبت میں ہیں۔ ان سب چیزوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جیسے انسانی تقاضوں سے آپ ماورا تھے۔ بڑی بڑی چیزیں آپ خاموشی اور صبر کے ساتھ جھیل جاتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ جب آپ بخار میں مبتلا تھے تو میں گیا، آپ چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ میں نے اوپر سے ہاتھ رکھا تو اتنا گرم تھا کہ میں گھبرا گیا کہ اتنا شدید بخار ہے۔ میں نے عرض کیا کہ 'یا رسول اللہ! بہت تیز بخار ہے۔' آپ نے فرمایا کہ 'ہاں مجھے تم میں کے دو آدمیوں کے برابر بخار چڑھتا ہے۔' [بخاری: ۵۶۶۰] مگر اس اطمینان سے آپ تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ کبھی کسی بیماری کی، کسی تکلیف کی، بھوک کی، پیاس کی، نیند کی شکایت کرتے ہوئے آپ نہیں پائیں گے اور نہ ان چیزوں کی وجہ سے آپ کے کام میں کبھی کوئی خلل پڑا ہے۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اللہ نے آپ کو جیسے ان سب چیزوں میں خصوصیات عطا فرمائی تھی، ایسے ہی شہوت کی طاقت میں بھی خصوصیت عطا فرمائی تھی۔ صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ 'ہم لوگوں کے درمیان تذکرہ ہوتا تھا کہ حضور ﷺ کو جو طاقت حاصل ہے وہ جنت کے چالیس مردوں کے برابر ہے۔' جنت کے ایک مرد کی طاقت دنیا کے سو مردوں کے برابر ہوگی۔ آپ اندازہ کریں حضور ﷺ کی طاقت کس حد تک پہنچی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی آپ کو تھکان وغیرہ کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ غزوہ احد میں آپ زخمی ہو گئے، خَود کی کڑیاں گھس گئی ہیں، پیشانی مبارک زخمی ہوگئی ہے، سامنے کے دانت شہید ہو گئے ہیں، مگر کسی روایت میں نہیں ملتا کہ آپ نے کسی سے شکایت کی ہو۔ صحابہ کرام نے بھی کہیں ذکر نہیں کیا کہ حضور نے کسی سے شکایت کی ہو۔ اس وقت آپ بالکل زخموں سے چور تھے، آپ کو ایک غار میں لٹایا گیا کہ آپ آرام کرلیں، اس وقت بھی آپ بالکل مطمئن تھے، جیسے کوئی مسئلہ ہی نہ ہو۔

رسول اللہ ﷺ کے تعددِ نکاح کا سبب:

آپ ﷺ کو چالیس جنتیوں کی طاقت ملی تھی، اس حساب سے تو آپ کا بہت نکاح ہونا چاہیے تھا، لیکن یہاں بھی آپ کے ضبط کا کمال ہے کہ آپ کو نکاح کی بہت طاقت تھی، مگر پچیس سال بغیر کسی نکاح کے گذار دیا، اور اس کمال سے گذارا کہ مکہ کی کسی عورت کو یہ شکایت نہیں ہوئی کہ ان کی نگاہ مجھ پر غلط پڑی ہے۔ الصادق الامین، العفیف جیسے القاب تو اسی زمانے کے ہیں۔ پچیس سال بغیر کسی نکاح کے مکمل پاکیزگی کے ساتھ آپ نے گذار دیے اور جب نکاح ہوا تو ایسی عورت کا انتخاب فرمایا جو دو مرتبہ بیوہ ہو چکی تھیں۔ یعنی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے دو شوہروں کا انتقال ہو چکا تھا، حضور ﷺ سے ان کا تیسرا نکاح تھا، اور عمر بھی ان کی ڈھل چکی تھی، وہ چالیس سال کی تھیں، اور اس خاتون کے ساتھ حضور ﷺ نے پچیس سال سے ترپین [۵۳] سال تک گذارا، اور جب چون [۵۴] سال کے ہوئے ہیں تو آپ نے دوسرا نکاح کیا ہے۔ جو معاندین کہتے ہیں

آپ نے اتنا زیادہ نکاح کیا، وہ اسے دیکھیں۔آپ کا نکاح زیادتیِ شہوت کی بنیاد پر نہیں ہوا، بلکہ اس ضرورت کی بنیاد پر ہوا ہے جو انسان کے بنیادی تقاضے ہیں۔اور حضور ﷺ کے نکاح کی خاص بات یہ ہے کہ آپ نے ایسی خواتین سے نکاح کیا جن کے ذریعہ دین کی اشاعت عام ہو،آپ کی تعلیمات عام ہو۔یہی وجہ ہے کہ اللہ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ کسی کو ماں نہیں بنایا،سب کو زوجہ ہی رکھا۔ماں بنتیں تو اپنے بچوں کے ساتھ مشغولیت ہوتی، یہاں تو ان کا دوسرا کام تھا،یعنی شوہر کی زندگی دنیا کو دکھانا تھا کہ یہ آپ کی اندر کی یعنی گھریلو زندگی ہے۔

یہ ساری خواتین جو آپ کے نکاح میں تھیں،آپ کے ساتھ ساتھ رہیں اور آپ کے ایک ایک عمل کو دیکھتی رہیں اور آپ کے بعد ایک فریضہ سمجھتے ہوئے ان باتوں کو امت تک پہنچا دیا،تاکہ حضور ﷺ جو اسوہ بنائے گئے ہیں، ان کی کوئی بھی چیز ڈھکی اور چھپی نہ رہے۔سب اللہ نے ظاہر کر دیا، باہر مرد تھے،ان کے ذریعہ باہر کی بات نقل ہوئی، اندر عورتیں تھیں،ان کے ذریعہ اندر کی بات معلوم ہوئی۔

رسول اللہ ﷺ کے نکاح کی حیثیت:

میں کہہ رہا تھا کہ نکاح انسانی ضرورت ہے،لیکن ایسا لگتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے نکاح میں ضرورت کا دخل نہیں رہا ہے، یا کم رہا ہے، جیسے کھانا کھانا ضرورت ہے،مگر حضور ﷺ جو کھانا کھاتے تھے،ایسا لگتا ہے کہ آپ کو اس کی ضرورت نہ ہو،بس ادباً کھا لیتے ہیں۔چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے ارشاد بھی فرمایا کہ:أَيُّكُمْ مِثْلِيْ،اِنِّيْ اَبِيْتُ يُطْعِمُنِيْ رَبِّيْ وَيَسْقِيْنِيْ۔ [بخاری:۱۹۶۵]تم میں میرا جیسا کون ہے؟ میں اپنے رب کے پاس رات گذارتا ہوں،میرا رب مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔مدتوں آپ کو نہیں ملتا تب بھی آپ کا کام چلتا۔

یہ ساری چیزیں آپ کی ضروریات کی قبیل سے نہیں تھی بلکہ اس لیے تھیں تاکہ دین کی اشاعت عام ہو،آپ کا اسوہ عام ہو،تاکہ سب لوگ جان لیں،عورتیں بھی جان

لیں، مرد بھی جان لیں۔ عورتوں کے احوال عورتوں کے ذریعہ اور مرد کے احوال مرد کے ذریعہ عام ہو جائے۔ چنانچہ حدیث کی کتاب بھری پڑی ہے، جہاں مردوں کی روایتیں ہیں، وہیں حضرت عائشہ کی روایت ہے، حضرت ام سلمہ کی روایت ہے، تمام ازواج کی روایتیں ہیں، اوران کے ذریعہ اندر کی باتیں معلوم ہوتی رہتی ہیں۔

ازواج مطہرات کا مقصدِ زیست:

یہ آپ کے نکاح کا مسئلہ تھا، آپ نے کل گیارہ نکاح کیے اور جس وقت دنیا سے تشریف لے گئے ہیں اُس وقت نو خاتون آپ کے یہاں موجود تھیں۔ حضرت خدیجہ کا انتقال مکہ میں ہو گیا تھا اور حضرت زینب بنت خزیمہ دو سال آپ کے ساتھ رہیں، باقی ساری ازواج آپ کے ساتھ رہیں۔ ازواج مطہرات کو آپ کے بعد نکاح کرنے کی اجازت نہیں تھی، یہ رسول اللہ ﷺ کی خصوصیت تھی، تاکہ وہ فارغ ہو کر یکسوئی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کو پھیلاتی رہیں۔ اسی لیے اللہ نے پابندی لگادی کہ نبی کی ازواج امت کی مائیں ہیں، ان سے نکاح نہیں ہوگا، تو اب وہ خالی ہیں، جب تک ان کو جینا ہے محض اسی کام کے لیے جینا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے جو کچھ سیکھا ہے، وہ امت تک پہنچائیں۔ چنانچہ صحابہ کرام بکثرت ان کے پاس آتے تھے اور مسائل معلوم کرتے تھے، حضور ﷺ کا طریقہ پوچھتے تھے، یہاں تک کہ ایک مرتبہ کچھ لوگ گئے اور کہنے لگے کہ ’ہم لوگ اس پیالہ کو دیکھنا چاہتے ہیں جس میں حضور ﷺ پانی پیتے تھے۔‘ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایک لکڑی کا پیالہ لائیں جس میں حضور ﷺ پانی نوش کیا کرتے تھے۔ پھر ان لوگوں نے کہا ’ہم وہ کپڑا دیکھنا چاہتے ہیں، جسے بچھا کر آپ سوتے تھے۔‘ تو وہ کپڑا لائیں جسے آپ سوتے وقت بچھاتے تھے۔ الغرض لوگ بڑی دور دور سے آکر امہات المومنین سے پوچھتے تھے۔ یہ مائیں پردے میں رہ کر ان کے مسائل کو حل کرتی تھیں، اور عموماً ایسا ہوتا کہ لوگ آکر عروہ بن زبیر، عبداللہ بن زبیر کو پکڑتے اور اپنے مسائل بتا کر حضرت عائشہ کے پاس بھیج دیتے، چوں کہ یہ دونوں حضرات حضرت عائشہ کے سگے بھانجے تھے،

اس لیے یہ لوگ فوراً حاضر ہو کر لوگوں کے مسائل کو حل کراتے۔

بعض اوقات صحابہ کرام میں اختلاف ہوتا تو حضرت عبداللہ بن عباس فوراً کسی کو بھیجتے کہ 'جاؤ! امی جان سے پوچھ کر آؤ۔' عصر کی نماز کے بعد کے بارے میں کسی نے بیان کیا کہ 'حضور نے دو رکعت نماز پڑھی ہے۔' اب اختلاف ہو گیا کہ آپ نے عصر کی نماز کے بعد منع فرمایا ہے کہ کوئی نفل نہیں ہے۔' حضرت عبداللہ بن عباس نے اس کی تصدیق کے لیے پہلے حضرت عائشہ کے پاس بھیجا کہ 'پتا کرو کہ حضور ﷺ نے عصر کے بعد کوئی نفل پڑھی ہے؟' انھوں نے جواب دیا کہ 'اس کے بارے ام سلمہ سے معلوم کرو۔' حضرت ام سلمہ کے پاس بھیجا کہ 'جاؤ! ان سے معلوم کرو۔' انھوں نے کہا کہ 'نہیں، لیکن ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ وفد بہت تھا، مشغولیت نے آپ کو بالکل گھیر لیا تھا تو ظہر کے بعد جو دو رکعت پڑھی جاتی ہے، وہ آپ نہیں پڑھ سکے تھے تو عصر کے بعد وہ دو رکعت کمرے میں آ کر پڑھے تھے۔' [بخاری:۱۲۳۳] یہ واقعہ ہوا تھا اور جو آپ نے منع کیا تھا وہ علی حالہ باقی ہے، عصر کے بعد کوئی نفل نہیں ہے۔ لیکن یہ آپ کی خصوصیت تھی کہ آپ نے نماز پڑھی، اور اس طرح کی آپ کی بہت سی خصوصیتیں ہیں۔

ایسے ہی نیند کا مسئلہ ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ 'یا رسول اللہ! آپ وتر پڑھنے سے پہلے ہی سو جاتے ہیں؟' اس پر رسول اللہ ﷺ فرمایا کہ 'عائشہ! 'اِنَّ عَیۡنَیَّ تَنَامَانِ وَلَا یَنَامُ قَلۡبِیۡ' [بخاری:۱۱۴۷] میری آنکھ سوتی ہے، میرا دل نہیں سوتا ہے۔ (یعنی نیند میں بھی پورے ہوش وحواس میں رہتا ہوں) یہ آپ کی خصوصیت ہے۔

یہ ساری چیزیں امہات المومنین سے ہی حل ہوتی تھیں۔ اور ان میں سب سے زیادہ جاننے والی اور روایت کرنے والی حضرت عائشہ صدیقہ تھیں جو صحابہ کرام کے مختلف مسائل کا تصفیہ کرتی تھیں۔

میں عرض کر رہا تھا کہ اللہ نے ازواج کو خدمت دین کے لیے منتخب کیا تھا، اسی

لیے اللہ نے اولاد کی مشغولیت سے ان کو خالی رکھا اور اللہ کے نبی ﷺ نے بھی کبھی اولاد کی تمنا ظاہر نہیں کی۔ اس لیے کہ آپ کا نکاح محض ضرورت کے تقاضہ کے بنیاد پر نہیں تھا، بلکہ ان کے ذریعہ گھر کے اندر کی بات سے دنیا کو باخبر کرنا تھا، اسی وجہ سے اللہ نے آپ کے نکاح کی تحدید نہیں کی۔ یہ محض آپ کی خصوصیت ہے۔

مطلقہ غیر مدخول بہا کا حکم:

اب ایسی عورت جن کو آپ نے ہاتھ نہیں لگایا ان کا مسئلہ اللہ نے بیان کیا ہے، یہ سارے اہل ایمان کا مسئلہ ہے۔ يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا۔ اے ایمان والو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو، پھر ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دو تو تمھارے لیے ان پر عدت کا حق نہیں ہے۔

عدت شوہر کا حق ہے، جب کسی عورت سے مرد نے نکاح کیا اور اسے استعمال کیا، پھر اسے چھوڑتا ہے تو اس نکاح کا کچھ تقاضے اور آداب ہیں: اور وہ یہ ہیں کہ تین حیض تک وہ عورت دوسرا نکاح نہیں کرسکتی، وہ اسی مرد کے نکاح میں بندھی ہوئی ہے، یا وہ عورت بوڑھی ہے جسے حیض نہیں آتا تو اس کے لیے حکم تین مہینے تک رکے رہنے کا ہے۔ اگر شوہر مر گیا ہے تو چار مہینہ دس دن تک عدت گذارے گی۔ لیکن ابھی مرد کے استعمال میں آئی نہیں، اس سے صحبت نہیں ہوئی ہے، اس سے پہلے ہی شوہر نے طلاق دے دی، تو اب اس عورت پر عدت نہیں ہے، اور وہ طلاق کے فوراً بعد دوسرا نکاح کرسکتی ہے۔

طلاق کے تعلق سے چند قابل غور باتیں

پہلی بات:

فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا۔ یہاں پر دو تین باتیں قابل غور ہیں، ان کو سمجھ لینا چاہیے: پہلی بات طلاق کے تعلق سے ہے۔ طلاق جائز ہے مگر مجبوری میں، اختیار میں طلاق پسندیدہ عمل نہیں ہے، طلاق ابغض المباحات ہے۔ یعنی جو چیزیں

مباح ہیں، ان میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے۔ نکاح ہوا تو زندگی بھر کا سودا ہورہا ہے، طلاق کے ذریعہ رشتہ ختم ہورہا ہے، اللہ کو یہ چیز پسند نہیں ہے، لیکن اگر کہیں ایسا ہو کہ نباہ نہیں ہو پا رہا ہے، زندگی غارت ہو رہی ہے تو اس صورت میں رشتہ نکاح ختم کرنے کی اجازت ہے۔ ممکن ہے کہ طلاق کے بعد مرد کو دوسری اچھی بیوی مل جائے، اور عورت کو دوسرا اچھا شوہر مل جائے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شوہر عورت کو ناپسند کرتا ہے اور کبھی عورت شوہر کو ناپسند کرتی ہے اور ان کے درمیان کوئی مناسبت نہیں ہو پاتی ہے، اسی لیے اللہ نے طلاق کی اجازت دی ہے۔ معلوم ہوا کہ بدتر حالات میں طلاق دی جاسکتی ہے۔ صحبت سے پہلے بھی طلاق دی جاسکتی ہے اور صحبت کے بعد بھی طلاق دی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ اچھا کام نہیں ہے۔

حضرت زید بن حارثہ کا نکاح حضور نے حضرت زینب بنت جحش سے کیا تھا، حضرت زید بار بار آکر شکایت کرتے تھے کہ 'حضرت! بات نہیں بنتی، ہمارا رشتہ نہیں چلے گا۔' آپ کو حضرت زید بھی پیارے تھے اور پھوپھی زاد بہن بھی پیاری تھیں، اس لیے آپ سمجھاتے تھے اور حضرت زید کو روکتے رہتے تھے کہ 'أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ' [الاحزاب: ۳۷] اپنی بیوی کو روک کر رکھو۔ لیکن جب بالکل صورت نہیں بن سکی تو آپ نے طلاق کی اجازت دی، حضرت زید الگ ہو کر مطمئن ہو گئے اور حضرت زینب اُن سے بہتر شوہر کے نکاح میں آگئیں۔ خلاصہ یہ کہ طلاق کی اجازت ہے، طلاق گناہ نہیں ہے مگر اس وقت جب کہ ضرورت ہو۔

دوسری بات:

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اللہ نے طلاق کی اجازت دی ہے، مگر اس کے بعد عناد اور جھگڑے کی اجازت نہیں دی ہے۔ ایک ضرورت کی بنیاد پر طلاق دیدیا لیکن جو اسلامی اخوت کا تقاضا ہے، وہ ختم نہیں ہونا چاہیے۔ اور اسلام کی ہی تعلیم ہے کہ اختلاف میں بھی

سنجیدگی برقرار رکھی جائے ،اچھا سلوک کیا جائے،کسی کے ساتھ اختلاف ہو تو اس کے ساتھ گالی گلوج کرنے اور اسے تکلیف پہنچانے کی اجازت نہیں ہے۔ حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان جنگ ہوئی تھی،اور وہ جنگ اجتہادی تھی،مگر اس کے باوجود جب موقع آیا تو حضرت معاویہ نے کہا کہ ’اے رومی کتے !اگر تو نے کوئی شرارت کی تو علی کی طرف سے لڑنے کے لیے سب سے پہلے میں ہی آؤں گا۔‘

طلاق ہمیشہ جھگڑے اور اختلاف میں ہی دی جاتی ہے ۔اللہ نے کیسی کیسی پابندی لگا رکھی ہے کہ اگر طلاق دیتے ہو تو گو کہ بنیاد جھگڑے کی ہے،مگر اس جھگڑے کو ختم کرو،طلاق کے بعد بیوی کو اپنے گھر ہی میں رکھو۔ یہ شرعی مسئلہ ہے کہ بیوی عدت اپنے شوہر کے گھر ہی میں گذارے گی۔اللہ نے فرمایا:’لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ۔‘ [الطلاق:۱] ان عورتوں کو طلاق کے بعد ان کے گھروں سے مت نکالو۔اور عورتوں کو حکم دیا:وَلَا يَخْرُجْنَ ۔ [الطلاق:۱] اور وہ نہ نکلیں، وہیں رہیں۔ظاہر بات ہے کہ اختلاف اور ناموافقت کی وجہ سے طلاق ہوئی ہے،اب حکم یہ ہے بیوی کو اپنے ساتھ ہی رکھو، بیوی کے ساتھ جو سلوک پہلے تھا وہ اب بھی کرو، کھانے پینے کا انتظام کرو،اس کا خرچ دو۔ہم لوگوں کے یہاں اس کا تصور ہی نہیں ہے کہ جھگڑے کے بعد بھی کسی کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاسکتا ہے۔اسی لیے جب طلاق ہو جاتی ہے تو اللہ کا حکم ایک طرف ، بیوی سب سے پہلے اپنے ماں باپ کے پاس چلی جاتی ہے، پھر بیوی کو اس کا بھی اطمینان نہیں رہتا ہے کہ شوہر اچھا سلوک کرے گا بھی یا نہیں۔

تیسری بات:

ایک مسئلہ یہ ہے کہ اگر بیوی خود شوہر کے گھر سے نکل جاتی ہے تو وہ بالکل نفقہ پانی کی مستحق نہیں رہے گی، وہ ناشزہ ہوگئی، نافرمانی کرگئی، اس لیے اس پر شوہر کی ذمہ داری بھی ختم ہوگئی۔ ہمارا مزاج بگڑ گیا ہے اور اس بگاڑ نے مسئلہ کو بگاڑ دیا ہے،مگر قاعدہ اور شریعت کی بات یہ ہے کہ کم از کم تین حیض تک شوہر کے گھر میں رہے،شوہر اس کے

کھانے پینے کا انتظام کرے۔اور صرف اتنا ہی نہیں، جب وہ وہاں سے جانے لگے تو اس کو ایک جوڑا کپڑا دے، عزت واحترام کے ساتھ اس کو رخصت کرے، تا کہ عورت کے دل میں شوہر کی قدر رہے، شوہر کے دل میں اس کی محبت رہے۔ جب جائے تو جھگڑ کر نہ جائے، لڑائی کا باقی رہنا اللہ کو پسند نہیں۔

ہمارا مزاج بالکل بگڑ گیا ہے، شوہر مطلقہ کو اپنے گھر میں رکھنے کے لیے تیار نہیں کہ ایک اجنبی عورت کو میں کیسے اپنے گھر میں رکھوں، عورت کے گھر والے تیار نہیں ہوں گے کہ پتہ نہیں زہر دے کر مار ڈالے گا یا اللہ جانے اس کے ساتھ کیا کرے گا؟ ہم لوگ جب کسی کو یہ مسئلہ بتاتے ہیں تو کہتا ہے کہ 'ارے مولانا! ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟' حالاں کہ دونوں گنہگار رہوتے ہیں، عورت بھی اور مرد بھی۔ کیوں کہ اللہ نے دونوں کو حکم دیا ہے کہ تم مت نکالو اور وہ نہ نکلے۔اس پر سے زیادتی یہ کہ لڑکی والے خرچہ بھی مانگتے ہیں، شریعت کا اس مسئلہ میں کوئی پاس ولحاظ نہیں ہوتا، بس اپنے نفس کے تقاضے کو پورا کیا جاتا ہے، اور اس پر سے نقصان بھی بیان کیا جاتا ہے کہ طلاق کے بعد شوہر کے گھر رکنے میں یہ یہ نقصان ہے۔ یہ صورت حال ہوگئی ہے۔الامان والحفیظ

عدت وطلاق کا شرعی طریقہ اور اس کا فایدہ:

شرعی حکم پر عمل کرنے میں فایدہ یہ ہے کہ اگر ایک یا دو طلاق دی ہے تو ممکن ہے کہ شوہر کے گھر رہنے سے مصالحت ہو جائے اور دونوں ساتھ ہنسی خوشی رہنے پر راضی ہو جائیں، مگر ہمارے یہاں ایک ٹیڑھا مسئلہ یہ بھی ہے آدمی ایک دو طلاق دیتا ہی نہیں، سیدھے تین طلاق دیتا ہے، اور یہ تین بھی بہت سنبھالتے سنبھالتے، ورنہ سو سو طلاق دے ڈالتے ہیں، جب کہ رسول اللہ ﷺ کو ایک آدمی کے متعلق خبر دی گئی کہ اس نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاق دیدی ہے۔آپ ﷺ غصہ ہو کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا 'کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ کھیل کیا جاتا ہے حالاں کہ میں تمھارے درمیان موجود ہوں۔' [نسائی: ۳۴۳۰]

یعنی کیا ضرورت تھی تین طلاق دینے کی، تین طلاق تو بہت آخری درجہ کی چیز ہے، بہتر یہ ہے کہ آدمی کو جب طلاق دینی ہی ہو تو ایک ہی طلاق دے، اور ایسی پاکی میں دے جس میں بیوی سے صحبت نہ کی ہو، اور پھر چھوڑ دے، عدت گذرنے دے۔ اس درمیان ممکن ہے کہ بات بن جائے تو رجعت کر سکتا ہے، اور نہیں تو وہ عدت کے بعد خود ہی نکاح سے نکل جائے گی۔ اب اس کے بعد دوبارہ اسی عورت سے نکاح کی خواہش ہوگی تو وہ بآسانی نکاح کر سکتا ہے۔ اللہ نے راستہ بہت کھول رکھا ہے، مگر ہم لوگ اسے بند کر دیتے ہیں، اور بند کرنے کے بعد شریعت کو الزام دیتے ہیں کہ اتنا ٹیڑھا مسئلہ ہے۔ یہ تین طلاق تو آخری صورت ہے جسے کبھی نہیں استعمال کرنا چاہیے، اور اگر تین طلاق دینا کسی وجہ سے ناگزیر ہو جائے تو فقہا نے اس کی یہ صورت لکھی ہے کہ 'جس طہر میں بیوی سے صحبت نہ ہوئی ہو، اس میں ایک طلاق دے، پھر عدت کا ایک حیض گذر جائے، دوسرے طہر میں پھر ایک طلاق دے، پھر دوسرے حیض کے گذرنے کے بعد تیسرے طہر میں تیسری طلاق دے۔ اب طلاق وقفہ وقفہ سے ہوگی اور یہ مہینوں کا چکر ہے، اس درمیان دو طلاق تک اگر اسے غلطی کا احساس ہو گیا تو رجعت کرنا ممکن ہے۔

اسی لیے فقہا نے ایک مرتبہ میں تین طلاق کو بدعت لکھا ہے۔ اگر ایک ہی مرتبہ میں تین دیدیا تو وہ بھی پڑ جائے گی۔ بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ اگر ایک مرتبہ میں تین طلاق دے دیا تو ایک ہی پڑے گی تین نہیں، یہ سراسر غلط ہے۔ کیوں کہ تین طلاق سے اللہ ناراض ہوتا ہے، اگر تین سے ایک ہی پڑتی تو کیوں ناراض ہوتا؟ ناراض ہونے کی کیا بات ہے؟ رجعت کر لے گا۔ تین طلاق گناہ ضرور ہے لیکن پڑے گی بہر حال، ایسا نہیں ہے کہ گناہ ہونے کی وجہ سے واقع ہی نہ ہو۔

عدم علم کی کارستانی:

میں الہ آباد میں تھا، ایک صاحب آئے اور کہا کہ 'میں نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیدی ہے۔' میں نے کہا 'اب کچھ نہیں ہو سکتا۔' تو کہنے لگا 'ارے مولانا! کوئی صورت

نکالیے۔' میں نے اس سے کہا کہ 'یہ طلاق دینے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا، اب کچھ نہیں ہو سکتا۔' پھر خود ہی کہنے لگا کہ 'اس کا حلالہ ہو چکا ہے۔' میں نے پوچھا 'یہ سب کام کتنے دنوں میں ہوا۔' تو کہتا ہے کہ 'یہی چار پانچ دن میں ہوا۔' میں نے اپنا سر پکڑ لیا اور کہا کہ 'اس سے تو کچھ نہیں ہوا، اس لیے کہ عورت ابھی تمھاری عدت میں تھی کہ تم نے اس کا دوسرا نکاح کر دیا، اور عدت میں نکاح نہیں ہوتا، جب نکاح نہیں ہوا تو اس نے گویا تمھاری بیوی سے زنا کیا، اور اس نے جب طلاق دیا تو اس کا کوئی اعتبار نہیں، اس لیے کہ نکاح ہی نہیں ہوا تھا۔

تجربے کی بات:

میں نے کتاب الطلاق کو ہدایہ وغیرہ میں بہت پڑھایا ہے، اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ 'طلاق نکاح کی طرح سنجیدگی چاہتا ہے، فوری طلاق، جوش میں، غصہ میں طلاق کبھی نہ دے، اپنے آپ کو ہوش میں رکھے۔ اللہ نے، رسول نے جو طریقہ بتلایا ہے اسی کے مطابق دے۔

علاحدگی کے وقت:

عورت کی جب عدت گذر جائے گی تو اس کو جانا ہے، تو جانے سے پہلے اللہ نے اس کا یہ انتظام کیا ہے کہ ' فَمَتِّعُوْهُنَّ ' ان کو ایک جوڑا کپڑا دے دو۔ اور کپڑا ایسا ہو جس کو پہن کر عورت باہر نکل سکے، جس میں برقع بھی شامل ہے۔ اس کو اتنا دیدیا جائے جس سے اس کی عزت افزائی ہو جائے، اور یہ حکم ہر طرح کی طلاق کی عدت گذارنے والی عورت کے لیے ہے، کسی میں یہ حکم لازمی ہے اور کسی میں مستحب، مگر دینا سب کو چاہیے، اس لیے کہ وہ نکاح سے الگ ہوئی ہے، اس پر طلاق پڑی ہے، اس سلوک سے اس کی کچھ عزت افزائی ہو جائے گی، اور اس لیے بھی تا کہ دو دلوں میں کدورت اور نفرت نہ پنپنے پائے۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ 'کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ سلام کلام چھوڑ کر رہے۔' [بخاری: ۶۰۶۵]

مَتِّعُوْهُنَّ میں اس کی بھی گنجائش ہے کہ اگر شوہر اپنی طرف سے ایک جوڑے

کے علاوہ دینا چاہے تو دے سکتا ہے۔ ’وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا‘ عزت کے ساتھ ان کو رخصت کرو۔

یہ ہے طلاق کے بعد کا مسئلہ، اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شریعت نے اس کا کتنا اہتمام کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس مسئلہ کو سمجھنے اور اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

❑❑❑

درسِ قرآن

[جامع مسجد شہر اعظم گڑھ]

رسول اور ازواجِ رسول کے تعلق سے کچھ خاص احکام

اور

درود شریف کی فضیلت و برکت

الحمدلله رب العالمین والصلوة والسلام علی سید المرسلین وعلی آله وصحبه اجمعین۔

اَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّا اَنْ یُّؤْذَنَ لَکُمْ اِلٰی طَعَامٍ غَیْرَ نَاظِرِیْنَ اِنَاہُ وَلٰکِنْ اِذَا دُعِیْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَأْنِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ اِنَّ ذٰلِکُمْ کَانَ یُؤْذِی النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیٖ مِنْکُمْ وَاللّٰہُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْھُنَّ مَتَاعًا فَاسْاَلُوْھُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِکُمْ اَطْھَرُ لِقُلُوْبِکُمْ وَقُلُوْبِھِنَّ وَمَا کَانَ لَکُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَلَا اَنْ تَنْکِحُوْا اَزْوَاجَہٗ مِنْ بَعْدِہٖ اَبَدًا اِنَّ ذٰلِکُمْ کَانَ عِنْدَ اللّٰہِ عَظِیْمًا﴿۵۳﴾ اِنْ تُبْدُوْا شَیْئًا اَوْ تُخْفُوْہُ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا﴿۵۴﴾لَا جُنَاحَ عَلَیْھِنَّ فِیْ اٰبَآئِھِنَّ وَلَا اَبْنَآئِھِنَّ وَلَا اِخْوَانِھِنَّ وَلَا اَبْنَاءِ اِخْوَانِھِنَّ وَلَا اَبْنَآءِ اَخَوَاتِھِنَّ وَلَا نِسَآئِھِنَّ وَلَا مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُنَّ وَاتَّقِیْنَ اللّٰہَ اِنَّ

اللّٰہَ کَانَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدًا﴿۵۵﴾ اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰۤا اَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا﴿۵۶﴾

سورہ احزاب کا اب آخری حصہ چل رہا ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات، آپ کے آداب، آپ کے ساتھ امت کو کیا معاملہ کرنا چاہیے؟ کیسا برتاؤ کرنا چاہیے؟ ان سب باتوں کو اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ اس رکوع کے اندر پہلی ہی بات جو اللہ نے ارشاد فرمائی ہے، وہ ایک خاص ادب ہے، یہ ادب تمام اہل اسلام کے لیے، تمام مسلمانوں کے لیے ہے، لیکن عنوان بنایا ہے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو، آپ کے ساتھ اس کی خصوصیت زیادہ ہے۔ ویسے یہ ادب سارے مسلمانوں کے لیے ہے۔فرماتے ہیں: یٰۤاَیُّہَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لاتَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّا اَنْ یُؤْذَنَ لَکُمْ ۔اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں داخل مت ہوؤ مگر اس وقت جب تم کو اس کی اجازت ملے۔ یہ حکم سب کے لیے ہے، کسی گھر میں داخل ہونے کے لیے اجازت لینا ضروری ہے۔

کسی کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے اجازت لینا ضروری ہے:

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لاتَدْخُلُوْا بُیُوْتاً غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَأْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰۤی اَہْلِہَا۔ [النور:۲۷] اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اپنے گھروں کے علاوہ دوسرے کے گھر میں داخل ہونا ہو تو پہلے استیناس کرو، انس حاصل کرو، اور انس حاصل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اجازت لو، اپنی شخصیت کو ظاہر کرو کہ میں فلاں ہوں اور آنا چاہتا ہوں، اجازت ہو تو آجاؤں۔ اس سے آدمی یہ جان لے گا کہ کون ہے تو اجازت دینے میں بھی سہولت ہوگی یا منع کرنے میں بھی سہولت ہوگی۔ اجازت کا ایک ضمیمہ اور تتمہ یہ ہے کہ پہلے سلام کرے، سلام کرنے کے بعد اُدھر سے اجازت ملے تو پھر اندر جائے اور خصوصیت کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں کے سلسلے میں یہ معاملہ زیادہ اہم ہے، تمام امت کو یہ حکم دیا گیا جو اس وقت موجود تھے کہ آپ ﷺ کے گھر میں اگر کسی کو جانا

ہوتو کسی کو اجازت نہیں اِلَّا اَنْ یُّوْذَنَ لَکُمْ مگر یہ کہ اجازت ہو۔

رسول اللہ ﷺ کا ولیمہ:

اس آیت کا ایک خاص واقعہ ہے۔ وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہوا تھا، اور یہ نکاح اللہ تعالیٰ نے خود آسمان پر کیا تھا: فَلَمَّا قَضٰی زَیْدٌ مِنْھَا وَطَرًا زَوَّجْنَاکَھَا۔ [الاحزاب:۳۷] جب زید نے زینب سے اپنی ضرورت پوری کرلی تو ہم نے تمھارا نکاح ان کے ساتھ کردیا۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا ازواج مطہرات سے کہا کرتی تھیں کہ تم لوگوں کا نکاح تمھارے اولیا نے زمین پر کیا ہے اور میرا نکاح اللہ تعالیٰ نے آسمان پر کیا ہے۔ یہ ان کی خصوصیت ہے۔ اسی موقع پر جب یہ نکاح ہوا تھا تو آپ نے ولیمہ کیا تھا، ولیمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت سادہ تھا، حقیقت یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو بہت سادگی سے ولیمہ شروع کیا تھا مگر اب آتے آتے اتنا بڑھ گیا ہے کہ بہت سے لوگوں کے یہاں ولیمہ نہیں رہتا بلکہ عَذَاباً اَلِیْمًا بن جاتا ہے۔ حضور ﷺ کے یہاں اِن تقریبات میں سادگی ملحوظ رہا کرتی تھی، آپ نے اپنے نکاح پر ولیمے کیے ہیں، مگر ایسا ولیمہ کیا ہے کہ ہم لوگوں کو سمجھ ہی میں نہیں آئے گا کہ یہ بھی کوئی ولیمہ ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے خیبر سے واپس تشریف لاتے ہوئے نکاح کیا تھا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ 'جس کے پاس جو کچھ ہو لے آؤ، ایک بڑا سا چمڑے کا دستر خوان بچھا دیا گیا اور لوگوں کے پاس جو کچھ تھا لاکر رکھ دیا اور فرمایا لوگوں کو بلالو اور بیٹھ کر کھالو، یہ ولیمہ ہو گیا'۔ [بخاری:۳۷۱]

سب سے زیادہ اہم ولیمہ جس میں اہتمام ہوا تھا، حضرت زینب کا ولیمہ تھا۔ آپ نے ارادہ فرمایا کہ ولیمہ کریں تو ایک صحابی حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ [یہ انصار میں بہت مالدار تھے] نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات طے کرالی تھی کہ آپ کے یہاں کوئی مہمان آئے گا تو کھانا میں بھیج دوں گا۔ چنانچہ اب تک ایسا ہی ہوتا تھا۔ ایک بار

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سفر پر چلے گئے، مدینہ سے باہر ابھی نکلے ہی تھے کہ اطلاع آئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ مہمان آگئے ہیں تو وہ بہت پریشان ہوئے کہ میں تو یہاں آگیا ہوں، اب کیسے کھانا بھجواؤں گا؟ تو وہ وہیں سے کہتے ہیں کہ ’میرا بیٹا قیس ہے، اس کو معلوم ہو جائے گا کہ رسول اللہ ﷺ کے یہاں مہمان آئے ہیں تو وہ کھانے کا انتظام کر کے بھیج دے گا، مگر وہ کہاں سے بھیجے گا؟ میں اس کو کچھ دے کر تو آیا نہیں ہوں۔ خیر اس کو معلوم ہے کہ میرا فلاں یہودی کے ساتھ کاروبار میں اشتراک ہے، اور میرا اس کے پاس مال اور غلہ موجود ہے، تو وہ اس کے پاس جائے گا اور جا کر اس سے کہے گا کہ ’اس وقت مجھے اتنا غلہ چاہیے، وہ یہودی انکار کرے گا تو اس کے ہاتھ پر مار کر چابی اس سے چھین لے گا اور چابی چھین کر غلہ نکال لے گا اور وہ میرا ہی غلہ ہوگا اور لا کر انتظام کر کے کھلائے گا۔‘

یہ وہ اپنے ہی طور پر کہہ رہے ہیں، یہ اللہ والے بھی عجیب لوگ ہوتے ہیں جو کہتے ہیں وہی ہوتا ہے۔ چنانچہ ہوا یہی، قیس کو معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کے یہاں مہمان آئے ہیں، ابّا ہیں نہیں۔ چنانچہ وہ جلدی جلدی یہودی کے پاس گئے اور کہا کہ ’ابا کا غلہ ہے نا، وہ لاؤ جلدی دو۔‘ اس نے انکار کیا تو انھوں نے ہاتھ پر مارا اور چابی چھین لی اور پھر غلہ نکال کر مہمانوں کے کھانے کا انتظام کر دیا۔

اس نکاح کے موقع پر بھی حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ’حضرت! میں کھانا بھجواتا ہوں، ولیمہ ہو جائے گا۔‘ چنانچہ انھوں نے ثرید بنوائی یعنی گوشت پکا کر اس میں روٹی توڑ دی، یہی ثرید ہوا کرتی تھی اور بڑی بڑی لگنوں میں کئی لگن بھیج دی۔ آپ کا مکان کوئی بہت لمبا چوڑا تو تھا نہیں، چھوٹے چھوٹے حجرے تھے، ایک حجرے میں وہ لا کر رکھی گئی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حضور ﷺ نے فرمایا کہ ’جاؤ دیکھو اور جو لوگ مل جائیں ان کو بلا لو۔‘ چنانچہ حضرت انس بازار کی طرف نکل گئے اور جو مسلمان ملتا، اُس سے کہتے کہ ’چلو حضور ﷺ کے یہاں ولیمہ ہے۔‘ کافی تعداد میں لوگ

آ گئے اور کھانا بھی ماشاء اللہ بہت تھا، سب نے بیٹھ کر کھالیا اور اس کے بعد سلام کر کے چلے گئے۔ یہ ولیمہ تھا، یہ اہم ولیمہ تھا، اس سے بڑا آپ ﷺ نے ولیمہ نہیں کیا۔

آیت کا پسِ منظر:

اخیر میں کچھ لوگ بیٹھے باتیں کرنے لگے، وہاں سے اٹھے نہیں۔ کھانے کے بعد عام طور پر بے تکلف جگہ ہوتی ہے تو لوگ بیٹھ جاتے ہیں۔ حضور ﷺ چاہ رہے ہیں کہ یہ لوگ جائیں اور بھی دوسرے کام ہیں، مگر وہ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں، کوئی نہیں جا رہا ہے اور آپ شرافت، مروت اور حیا کی وجہ سے یہ نہیں کہتے کہ 'بھائی! اب تم لوگ جاؤ یہاں سے۔' اور وہ لوگ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں اور آپ تنگ ہو رہے ہیں۔ اس موقع سے یہ آیت نازل ہوئی کہ 'اے ایمان والو! ادب کی بات یہ ہے کہ جب بلایا جائے تو آؤ اور جب کھا چکو تو بیٹھے مت رہو، چلے جاؤ، تا کہ گھر والا خالی ہو کر اپنا کام کرے، تمھارے ساتھ پھنسا نہ رہے۔' اس آیت میں مہمان کا اور میزبان کا، سب کا ادب بتا دیا۔ مہمان کا ادب یہ ہے کہ جب فارغ ہو جائے تو چلا جائے اور میزبان کی شرافت یہ ہے کہ کہنا نہ پڑے کہ اب آپ لوگ تشریف لے جایئے۔

اسی لیے فرمایا کہ 'اے ایمان والو! تم نبی کے گھر میں داخل مت ہوؤ مگر یہ کہ تم کو اس کی اجازت دی جائے۔ اِلیٰ طَعَامٍ غَیْرَ نَاظِرِیْنَ اِنَاہ ۔ دعوت دی جائے تم کو کھانے کے واسطے، مگر پکنے کی راہ مت دیکھو۔' وَلٰکِنْ اِذَا دُعِیْتُمْ'۔ لیکن جب تم کو بلایا جائے تو داخل ہو جاؤ۔ 'فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا۔' جب کھا کر فارغ ہو گئے تو اب ضرورت باقی نہیں رہی تو میزبان کو فارغ کر دو کہ وہ اپنے کام میں لگے ۔ 'وَلا مُسْتَأْنِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ۔' اور آپس میں باتیں کرنے کے لیے جی لگا کر مت بیٹھو کہ بڑی پر لطف باتیں ہو رہی ہیں، ذرا بیٹھ کر باتیں کر لیں۔ نہیں! ہر ایک کی ضروریات کا لحاظ کرنا چاہیے۔

یہ بات ایک عام انسانی طبیعت جانتی ہے مگر اللہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا

اتنا اہتمام کیا ہے کہ مسلمانوں کو یہ ادب سکھایا کہ جب ان کی خدمت میں جاؤ تو جتنی ضرورت ہو، اُتنی دیر رہو اور جب ضرورت پوری ہو جائے تو وہاں سے چلے جاؤ، تا کہ آپ ﷺ کو انتظار کی تنگی نہ ہو، اور یہ کہنے پر مجبور مت کرو کہ 'بھائی! آپ لوگ جایئے، کام ہوگیا' اس لیے کہ یہ میزبان کی شرافت اور اس کی حیا کے خلاف ہے کہ وہ کہے کہ 'صاحب! چلے جایئے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔

'اِنَّ ذَالِکُمْ کَانَ یُؤذِی النَّبِیُ۔' یہ بات نبی کو تکلیف پہنچاتی ہے۔ 'فَیَسْتَحْیِیُ مِنْکُمْ۔' پھر وہ تم سے حیا کرتے ہیں، نہیں کہہ پاتے۔ 'وَاللّٰہُ لَا یَسْتَحْیِیُ مِنَ الْحَقُ۔' اور اللہ تعالیٰ کو حق کے بیان کرنے میں کوئی حیا دامن گیر نہیں ہے۔ یہ نہیں کہ وہ رک جائیں اور نہ بیان کریں۔ اللہ تعالیٰ تو تمام احکام کو بیان کرنے والے ہیں۔

ازواجِ مطہرات کا ادب:

'وَاِذَا سَأَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعاً فَاسْئَلُوْا هُنَّ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ' اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ ادب بھی بیان کیا کہ ازواج مطہرات جوامت کی مائیں ہیں، لیکن ماں ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جیسے سگی ماں سے کوئی پردہ نہیں ہوتا، ان سے پردہ نہ ہو۔ فرمایا جب کوئی سامان ان سے مانگنا ہو تو 'فَاسْئَلُوْا مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ' پردے کے پیچھے سے مانگ لو، یہ سوچ کر کہ ماں ہیں، سامنے آنے کی ضرورت نہیں۔

مفسد دلیل:

اب لوگ دلیلیں دیتے ہیں کہ 'صاحب! بیٹی ہی تو ہے۔' ہم لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ کہتے ہیں کہ 'ملنے میں کیا مضائقہ ہے، آیئے اندر چلیے! کیوں اندر آئیں؟ آپ کی بیٹی ہی تو ہے، بہن ہی تو ہے۔ بھائی! ایسی بیٹی اور بہن تو تمام دنیا ہے، انھیں بیٹی اور بہنوں سے پردہ کا حکم ہے۔ یہ مت کہیے کہ آپ کی بیٹی ہے، اس سے خرابی پیدا ہوتی ہے، ورنہ بھائی اور بہن تو سبھی ہیں۔

حضرت امیر معاویہ کے پاس ایک آدمی آیا، اس نے کہلوایا کہ 'حضرت سے کہہ دو

کہ آپ کا ایک سگا بھائی آیا ہے۔' حضرت نے کہا کہ 'پوچھو کیا نام ہے؟' نام بتایا تو انھوں نے کہا کہ 'میرا کوئی سگا بھائی اس نام کا تو ہے نہیں۔' پھر کہا 'اچھا بلاؤ۔' بلایا گیا تو پوچھا کہ 'کیا بات ہے؟ آپ کون ہیں؟ آپ نے کہلوایا کہ میں آپ کا سگا بھائی ہوں؟' تو جواب دیا کہ 'ہاں سگا ہوں، اس لیے کہ آپ بھی حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور میں بھی حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہوں، اس لیے سگا بھائی ہوں۔' حضرت نے کہا 'اچھا یہ بات ہے۔' پھر آپ نے پوچھا 'کیا بات ہے؟' کہنے لگا کہ 'یہ میری ضرورت ہے، پوری کردیجیے۔' تو کہا 'ٹھیک ہے۔' خادم سے کہا کہ 'ایک درہم دے دو۔' ایک درہم دیا تو کہا کہ 'آپ کا سگا بھائی آیا ہے اور آپ اس کو ایک درہم دے رہے ہیں؟' کہا 'بھائی! میرے سگے بھائی اتنے زیادہ ہیں کہ اگر سب آجائیں تو ایک درہم بھی نہیں ملے گا، ہم تو تم کو تمھارے حصہ سے زیادہ دے رہے ہیں۔' تو یہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ 'صاحب! یہ بیٹی ہے، یہ بہن ہے، یہ فلاں ہے، اس لیے ان سے پردے کی کوئی ضرورت نہیں۔'

ازواج مطہرات ماں ہیں لیکن ان سے پردہ ضروری ہے:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات جو واقعی ماں ہیں اور ابھی اللہ تعالیٰ حکم دیں گے کہ حضور ﷺ کے بعد بھی ان سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے، امت کا کوئی بھی فرد اُن سے نکاح نہیں کرسکتا، تمام امت کے لیے ان سے نکاح حرام ہے۔ اس لیے کہ وہ سب کی ماں ہیں، مگر اس کے باوجود پردہ کا حکم ان کے لیے بھی ہے کہ اگر ان سے سامان مانگنا ہو تو ان کے سامنے مت جاؤ، بلکہ پردہ کے پیچھے سے سامان مانگو۔ 'وَاِذَا سَئَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعاً فَاسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ'۔ اور جب ان سے کوئی سامان طلب کرنا ہو تو مانگو پردے کے پیچھے سے۔

'ذَالِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ' یہ بات خوب ستھرائی کی ہے تمھارے قلب کے لیے اور ان کے قلب کے لیے۔ دونوں کا دل صاف ستھرا رہے، ایک دوسرے کو دیکھ کر کہیں ایسا نہ ہو کہ دماغ میں شیطان وسوسہ ڈال دے اور انسان انسان ہے، اس کی

کمزوریاں عجیب وغریب طور پر ظاہر ہوتی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی احتیاط:

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف میں بیٹھے ہوئے تھے اور آپ کی زوجۂ مطہرہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا جن کا حجرہ مسجد سے کچھ فاصلہ پر تھا، وہ حضور ﷺ کے پاس آئیں اور حضور ﷺ سے باتیں کرنے لگیں۔ رات کا وقت تھا، آپ سے باتوں سے فارغ ہوئیں تو اپنے حجرے کی طرف تو جانے لگیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو ساتھ لے کر مسجد کے کنارے تک آئے۔ آپ اعتکاف میں تھے، مسجد سے باہر تو نکل نہیں سکتے تھے تو مسجد کے کنارے تک آئے۔ جوں ہی مسجد کے کنارے آئے تو دیکھا کہ دو آدمی آرہے تھے، حضور ﷺ نے فرمایا 'ٹھہر جاؤ۔' ٹھہرالیا تو فرمایا کہ 'مجھ کو تو جانتے ہی ہو، اور یہ تمھاری ماں صفیہ ہیں۔' [بخاری:۲۰۳۹] ان دونوں نے عرض کیا کہ 'حضرت! کوئی بات نہیں۔' فرمایا 'نہیں، انسان کے دل میں شیطان وسوسہ ڈال سکتا ہے، اس لیے میں نے تم کو بتادیا۔ اگر تم نہ جانتے تو شیطان وسوسہ ڈال سکتا تھا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پتا نہیں کس خاتون سے باتیں کررہے تھے، کون سی عورت تھی جس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور جب بتادیا کہ یہ میری بیوی ہے تو دل میں کوئی خیال اور وسوسہ نہ باقی رہے گا۔

انسانی طبیعت بدگمانیوں کے لیے بہت تیز ہے۔ اسی طرح سے نگاہ کی خرابیوں سے بھی بہت جلد متاثر ہوتی ہے۔ اس لیے کہیں ایسا نہ ہو کہ ازواج مطہرات پر نگاہ پڑے اور تمھارے دل میں کوئی برا خیال آجائے، اس لیے پردہ ہی میں رہو، پردہ کے پیچھے سے ہی سوال کرو۔ 'ذَالِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ'۔ یہ بات تمھارے قلوب کے لیے بھی اور ان کے قلوب کے لیے بھی زیادہ پاکیزگی کی چیز ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے ادب کے تعلق سے ایک اصولی بات:

'وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ' ایک اصولی بات فرماتے ہیں کہ تمھارے لیے حق نہیں ہے اور تمھارے لئے جائز نہیں ہے کہ اللہ کے رسول کو کوئی بھی ایذا پہنچاؤ،

تمھاری وجہ سے رسول کو کوئی الجھن پیش آجائے یا کوئی ایذا پیش آجائے، یہ جائز نہیں ہے۔ ہمیشہ اس کا اہتمام کرو کہ آپ ﷺ کو کوئی ایذا تمھاری وجہ سے نہ پہنچنے پائے، اور اس کا اتنا اہتمام کیا کہ سورۂ حجرات میں ارشاد فرمایا کہ: یٰـاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ۔ اور آگے فرمایا: یٰـاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ۔ اے ایمان والو! نبی سے باتیں کرو تو تمھاری آواز نبی کی آواز سے بلند نہیں ہونی چاہیے۔ ’وَلَا تَجْھَرُوْا لَہٗ بِالْقَوْلِ کَجَھْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ۔‘ اور جیسے ایک دوسرے سے تڑک تڑک کر باتیں کرتے ہو، رسول سے ایسے بات نہ کرنا۔ رسول کے سامنے تمھاری آواز پست رہنی چاہیے، جھکی رہنی چاہیے، باادب رہنی چاہیے۔

حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی خطابت:

ایک صحابی ہیں حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ، وہ صحابہ میں خطیب مشہور تھے، بڑی زبردست ان کی تقریر ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ بنی تمیم کے لوگ آئے، بنی تمیم ایک بہت بڑا قبیلہ تھا، اس میں شاعر بہت تھے۔ انھوں نے کہا کہ ’ہم اس شرط پر ایمان لائیں گے کہ آپ اپنا شاعر لائیں اور ہم اپنا شاعر لائیں، آپ اپنا خطیب لائیں، ہم اپنا خطیب لائیں، جس کا شاعر اور مقرر غالب آجائے گا، اُسی کی بات مانی جائے گی۔ عجیب مطالبے بھی لوگوں کے ہوتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ’ٹھیک ہے، لاؤ‘۔ حضرت نے اپنی جانب سے حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو آگے کر دیا، اُن کے شاعر نے بھی قصیدہ پڑھا اور حضرت حسان نے بھی قصیدہ پڑھا۔ اس کے بعد تقریر کی نوبت آئی، ان کے خطیب نے بہت زوردار تقریر کی۔ عربوں کے یہاں خطیب ہمارے یہاں کے اردو خطبا سے زیادہ شعلہ بیاں ہوتے ہیں۔ ہم لوگ دیوبند میں پڑھتے تھے تو حلب کے ایک خطیب آئے تھے، انھوں نے تقریر کی (اللہ اکبر!) جب وہ تقریر کر رہے تھے تو دارالحدیث کے اندر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سب طرف آگ لگ جائے گی، اتنی شعلہ بیانی تھی۔ بہر کیف! بنی تمیم کے خطیب نے بڑی زوردار تقریر کی، اس کی تقریر کے بعد

حضرت نے ثابت بن قیس کو بلایا۔ثابت بن قیس کی آواز بھی بہت بلند اور ماشاء اللہ الفاظ پر بڑی قدرت تھی۔تقریرشروع کی۔بنی تمیم مان گئے کہ ’صاحب! آپ کا مقرر ہمارے مقرر سے بڑھ گیا اورآپ کا شاعر ہمارے شاعر سے بڑھ گیا،لہٰذا ہم لوگ ایمان لائیں گے۔‘

ایسی ایسی شرطیں لوگ لے کر آتے تھے،مگرحضورصلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں کوئی کمی نہیں تھی،ہرطرح کےلوگ موجود تھے۔

حضرت ثابت بن قیس اورحضرات شیخین کا ادب:

میں یہ بتلا رہا تھا کہ ثابت بن قیس کی آواز بہت بلند تھی۔ جب یہ آیت نازل ہوئی: یٰاَیُّھَاالَّذِیۡنَ آمَنُوۡا لَاتَرۡفَعُوۡا اَصۡوَاتَکُمۡ فَوۡقَ صَوۡتِ النَّبِیِّ۔ تمھاری آواز نبی کی آواز سے بلند نہیں ہونی چاہیے،تو وہ گھر میں بیٹھ گئے،نکلے ہی نہیں۔ ایک دن گزرگیا،دودن گزرگئے، تین دن گزرگئے،نہیں آئے تو حضورﷺ نے پوچھا کہ ’بھائی! ثابت بن قیس کہاں ہیں؟‘لوگوں نے بتایا کہ ’حضرت! وہ گھر میں بیٹھ کر رورہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میری آواز تو قدرتاً بہت بلند ہے، میں کتنا ہی آہستہ بولوں گا تب بھی معلوم ہوگا کہ بلند ہے۔اس لیے میں کیا کروں؟ مجھے خوف ہے کہ میں اس کی وجہ سے جہنمی نہ بن جاؤں؟‘تورسول اللہﷺ نے فرمایا کہ نہیں،وہ توجنتی ہیں۔‘[مسند احمد:۸۷۵۹]

اسی طرح حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کا یہ حال ہوگیا تھا کہ وہ لوگ بات کرتے تھےتو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوکئی مرتبہ پوچھنا پڑتا تھا کہ ’کیا کہا؟‘ آواز آہستہ ہوتی تھی۔ نبی کا جہاں اتنا ادب ہے، وہاں ظاہر بات ہے کہ کسی امتی کو یہ حق نہیں ہے کہ نبی کوتکلیف پہنچائے۔

وفات کے بعد رسول اللہﷺ کا ادب:

حضورصلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک،آپ کی حیات تک تو یہ بات بالکل عیاں تھی،آپ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد بھی صحابہ نے اس کا نمونہ پیش کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے اور دو آدمی آکر زور زور سے باتیں کرنے لگے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو بلایا اور کہا کہ 'ان دونوں کو بلا لاؤ، یا کنکری اٹھائی اور ایک آدمی کے اوپر ہلکے سے مارا، وہ متوجہ ہوا تو اشارہ سے بلایا اور فرمایا کہ 'تم لوگوں کا گھر کہاں ہے؟' انھوں نے بتایا کہ 'حضرت! ہم لوگ فلاں دیہات کے رہنے والے ہیں۔' کہا 'اچھا ٹھیک ہے، ابھی تو پہلی مرتبہ ہے، اس لیے چھوڑ دیتا ہوں۔ تم لوگوں کو پتا نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آواز بلند نہیں کرنی چاہیے۔ قبر اطہر موجود ہے اور تم اتنی زور سے بول رہے ہو۔' اور کہا کہ 'اگر تم لوگ مدینے کے ہوتے تو میں سزا دیتا۔'

ایذا کی ایک صورت یہ بھی ہے:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ امت کے اعمال میرے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ اب ظاہر سی بات ہے ہر طرح کے اعمال پیش ہوتے ہیں، اگر امت کے وہ اعمال پیش ہوتے ہوں جن سے آپ کو تکلیف پہنچے تو یہ بھی اسی میں داخل ہے کہ 'مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ۔' تمھارے لیے جائز نہیں ہے کہ تم اللہ کے رسول کو تکلیف پہنچاؤ۔

ازواج مطہرات سے نکاح کا عدم جواز اور اس کی حکمت:

'وَلَا اَنْ تَنْكِحُوْا اَزْوَاجَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ اَبَدًا۔' اور اس کی بھی اجازت نہیں ہے کہ ان کے بعد ان کی بیبیوں سے نکاح کرو، وہ تمھاری مائیں ہیں۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام ازواج آپ کے بعد اپنے اپنے گھروں میں بیٹھی رہ گئیں اور سب کا جنازہ اپنے گھروں سے نکلا۔ کسی کو دوسرا نکاح کرنے کا خیال ہی نہیں آیا، حالاں کہ اس کا عربوں میں بہت رواج تھا۔ ایک آدمی مرتا تھا، عدت گذرتی نہیں تھی کہ لوگوں کے دلوں میں خیال آنے لگتا تھا کہ فلاں عورت خالی ہو رہی ہے، عدت گذر جائے تو اس سے نکاح کرنا ہے۔ کوئی عورت بیٹھی نہیں رہتی تھی۔

یہ تو بیوہ کا نکاح ہمارے یہاں پہاڑ جیسا مشکل بنا دیا گیا ہے، ورنہ عربوں میں کچھ تھا ہی نہیں، چاہے وہ بوڑھی ہی کیوں نہ ہو، نکاح کرلیا جاتا تھا۔ عورت کسی شوہر کی حفاظت میں ہر دم رہے، یہ ان کا تصور تھا۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے بارے میں اس کی اجازت نہیں تھی کہ ان سے نکاح کیا جائے۔ اور اس میں نکتہ کی بات یہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جب وصال ہوا ہے، دنیا سے تشریف لے گئے ہیں تو تمام اہل سنت کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ اپنی قبر میں زندہ ہیں، نکاح ان کا ٹوٹا ہی نہیں ہے۔ مرنے سے نکاح ختم ہو جاتا ہے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح مرنے سے ختم ہوا ہی نہیں ہے، اور اسی طرح مرنے سے مال کی ملکیت بھی ختم ہو جاتی ہے، اس مال میں وراثت جاری ہوتی ہے، جو وارث ہوتے ہیں سب مال ان کا ہو جاتا ہے۔ کہنے یا دینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مورث مر گیا اس کا جو بھی مال ہے وہ خود بخود تمام وارثوں کا ہو گیا۔ یہ جبری ملکیت ہے، اس میں اختیار کا دخل نہیں ہے۔ میں اگر وارث ہو رہا ہوں اور میں کہوں کہ 'میں نہیں لوں گا'، تو میرے اس کہنے سے کچھ نہیں ہوگا، وہ میرا ہی رہے گا۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت کے بارے میں جب اختلاف ہوا کہ نبی کی وراثت کا کیا ہو؟ اسی وراثت پر شیعوں کا فرقہ بنا ہے۔ صحابہ نے رسول اللہ ﷺ کی وراثت حضرت فاطمہ کو نہیں دی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ایک بات کہی تھی، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ 'میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ 'ہمارا [گروہ انبیا کا] کوئی وراث نہیں ہوتا، جو کچھ ہم چھوڑ جائیں، وہ صدقہ ہوتا ہے۔' [ابوداؤد:۲۹۶۳]

بات یہ ہے کہ آدمی مرتا ہے تو اس کی ملکیت مال سے ختم ہو گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے گئے تو ان کی ملکیت ختم نہیں ہوئی ہے، وہ آپ ہی کی ملکیت میں ہے، اس لیے وراثت جاری ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ آپ کی جو ملکیت ہے، بعد میں وہ سب صدقہ ہو جائے گا، اور آپ ہی کی طرف سے ہوگا، ایسا نہیں

ہے کہ اس پر کسی کی ملکیت ہوجائے۔ یہ عام انسانوں کے لیے مسئلہ ہے کہ اگر کسی شخص نے مرنے کے وقت وصیت کی اور اس کے پاس مال ہے تو تہائی مال میں وصیت کرنا جائز ہے، دو تہائی مال تو ورثہ کا ہو جائے گا، اس میں وصیت کرنا اس کے لیے درست بھی نہیں ہوگا، لیکن ایک تہائی مال میں وصیت کرسکتا ہے۔

وصیت کا مسئلہ:

ایک شخص نے مرنے سے پہلے وصیت کی کہ 'میرا جو مال ہے، اس کے تہائی حصہ سے میرے لیے بقرعید میں قربانی کردینا یا تہائی حصے سے میری طرف سے کسی کو حج کرادینا' اس نے کہہ دیا تو یہ اس کی وصیت ہوگئی، اب دو تہائی کے ورثہ مالک ہوگئے، مگر ایک تہائی جو بچا ہے جس کی وصیت کی ہے، اس کا اب کوئی مالک نہیں ہے، یہی مالک ہے جو مرگیا ہے۔ مرنے کے بعد بھی اس پر اس کی ملکیت برقرار ہے۔ اس کی شریعت اجازت دیتی ہے۔ اب جس طریقے سے وصیت کی ہوگی، اس وصیت کو پورا کرنا ہوگا۔ اگر اس نے یہ وصیت کی ہے کہ میرے اس مال سے قربانی کی جائے تو قربانی کی جائے گی۔ اب اس کا مال صدقہ ہوگا، کسی بھی مال دار کو کھانا جائز نہیں ہے۔ بیٹے نے باپ کی طرف سے اسی وصیت میں اسی مال سے قربانی کردی تو اس قربانی کے گوشت کو بیٹا نہیں کھاسکتا، جو مال دار ہیں وہ نہیں کھاسکتے۔ اس قربانی کے گوشت کو غربا میں تقسیم کیا جائے گا۔ اس لیے کہ مرنے والا جس کی طرف سے قربانی ہورہی ہے وہ دنیا سے جاچکا ہے، اب اس کا کل مال صدقہ ہے۔ ہاں اگر کسی بیٹے نے اپنے باپ کی طرف سے اپنے مال سے قربانی کی ہے، تو چوں کہ اپنے مال سے قربانی کی ہے، اس لیے وہ خود بھی کھاسکتا ہے، دوسروں کو بھی کھلا سکتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی ملکیت اور نکاح وفات سے ختم نہیں ہوا:

بہرحال! رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے تو مال پر سے آپ کی ملکیت ختم نہیں ہوئی، مال آپ ہی کی ملکیت میں ہے، دنیا سے جانے کے بعد بھی آپ

ہی اس کے مالک ہیں، اب وہ صدقہ ہوا، ورثہ کو نہیں ملے گا، اور اس بات پر تمام صحابہ کا اجماع ہوگیا۔ حضرت فاطمہ حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہم نے بھی اس کو قبول کیا، سب نے قبول کیا، تمام صحابہ کا اس پر اجماع ہوگیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مال آپ کے دنیا سے جانے کے بعد آپ ہی کا ہے، اس میں وراثت جاری نہیں ہوگی۔ اسی طرح ازواج مطہرات آپ ہی کی بیبیاں ہیں، دوسرے کی بیوی نہیں بن سکتیں۔ یہ بیویاں آپ ہی کی رہیں گی، دنیا سے جانے کے بعد بھی آپ ہی کے نکاح میں رہیں گی۔ اللہ نے فرمایا کہ: وَلاَاَنْ تَنْكِحُوْا اَزْوَاجَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ اَبَدًا۔ آپ کے بعد آپ کی بیویوں سے نکاح کرنا درست نہیں ہے۔ اِنَّ ذَالِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْماً۔ یہ بات اللہ کے نزدیک بہت بڑی ہے۔ اگر کسی نے اس کے خلاف کیا تو بہت بڑا گنہ گار ہوگا۔

اِنْ تُبْدُوْاشَيْئًا اَوْتُخْفُوْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا۔ اگر تم کسی چیز کو کھول کر کہو، یا اس کو چھپاؤ، اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ دل کی بات بھی اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اور جو کچھ تم کہوگے اس کو بھی اللہ تعالیٰ جانتے ہیں۔ نبی کا احترام صرف زبان سے نہیں بلکہ نبی کا احترام دل سے ہونا چاہیے۔ تم زبان سے احترام کرو اور تمھارے دل میں نہ ہو، یہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے۔ دل اور زبان دونوں کو یکساں کرنے کے لیے فرمادیا کہ اللہ تعالیٰ کو سب معلوم ہے، جو کھل کر کہوگے، صاف واضح کہوگے، وہ بھی خدا کو معلوم ہے اور جو تمھارے دل میں چھپی ہوئی بات ہے، وہ بھی معلوم ہے۔

پردہ کن سے ضروری ہے اور کن سے نہیں:

پھر ازواج مطہرات کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ان کا پردہ تمام لوگوں سے ہے، ہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جن سے پردہ نہیں ہے، وہ کون ہیں؟ وہ وہی ہیں جن کی تفصیلات معلوم ہے۔

’لاجُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِىْ آبَائِهِنَّ۔‘ ان پر کوئی حرج نہیں ہے، کوئی گناہ نہیں ہے ان کے باپ کے بارے میں۔ یہ ازواج مطہرات ہیں، اگرچہ پوری امت کی ماں ہیں،

لیکن جوان کے والد ہیں وہ ان کے والد ہیں۔امت کے اعتبار سے وہ بھی بیٹے ہیں لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ باپ ہیں۔والد کے سامنے آنے میں کوئی حرج نہیں ہے، ان سے کوئی پردہ نہیں ہے۔

'وَلَا اَبْنَائِهِنَّ۔' اور بیٹوں سے بھی کوئی پردہ نہیں ہے۔حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری ازواج بیوہ ہی تھیں، اور دوسرے شوہروں کے یہاں صاحبِ اولاد تھیں، تو ان کی وہ اولاد جو پہلے شوہر سے ہیں، ان اولادوں سے ان کا پردہ نہیں ہے، وہ اگر آتے ہیں تو ان سے پردہ نہیں ہے۔

'وَلَا اِخْوَانِهِنَّ۔' اور نہ بھائیوں سے کوئی پردہ ہے۔ان کے بھی بھائی ہیں، سگے بھائی ہیں، باپ شریک بھائی ہیں، ماں شریک بھائی ہیں۔ یہ تین طرح کے بھائی ہوتے ہیں۔ چچازاد، بھائی نہیں، ماموں زاد، بھائی نہیں، پھوپھی زاد، بھائی نہیں۔ یہ جو ہم نے چچازاد، ماموں زاد، پھوپھی زاد کہا ہے، بھائی کہنے کی وجہ سے لوگوں کو دھوکہ ہوجاتا ہے کہ شاید ان سے بھی کوئی پردہ نہیں، مگر حقیقت میں شرعاً وہ بھائی نہیں ہیں، وہ نامحرم ہیں، چاہے چچازاد ہوں، چاہے ماموں زاد ہوں، چاہے پھوپھی زاد ہوں۔ان سے نکاح کرنا جائز ہوتا ہے۔لہٰذا ان سے پردہ ہے۔ بھائی وہ ہے جو سگا ہو، یعنی ماں باپ دونوں ایک ہوں، یا علاتی بھائی ہو، یعنی باپ ایک ہو ماں الگ الگ ہو، یا اخیافی بھائی ہو، یعنی ماں ایک ہو باپ الگ الگ ہو، تو ان بھائیوں سے کوئی پردہ نہیں ہے۔

'وَلَا اَبْنَاءِ اِخْوَانِهِنَّ۔' اور نہ بھتیجوں سے پردہ ہے۔ بھائی کے بیٹے یعنی انھیں تینوں بھائی [سگا بھائی، باپ شریک بھائی، ماں شریک بھائی] کی جو اولادیں ہیں وہ سب بھتیجے ہیں اور بھتیجوں سے کوئی پردہ نہیں ہے۔

'وَلَا اَبْنَاءِ اَخَوَاتِهِنَّ۔' اور نہ بہنوں کے بیٹوں سے پردہ ہے۔بہنیں بھی تین ہیں: سگی بہن، باپ شریک بہن، ماں شریک بہن۔ اِن کے بیٹے بھانجے ہیں۔ بھانجوں سے کوئی پردہ نہیں، لیکن اگر چچازاد بہن کا بیٹا ہو تو کہنے کے لیے وہ بھانجہ ہے، لیکن شرعاً وہ

بھانجہ ہے نہیں، لہٰذا اس سے پردہ ہے۔

'وَلَا نِسَآئِهِنَّ۔' اور نہ اپنی عورتوں سے پردہ ہے۔ اپنی عورتیں یعنی مسلمان عورتوں سے کوئی پردہ نہیں۔

'وَلَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ۔' اور نہ ان سے جو ان کی ملکیت میں ہوں۔ یعنی باندیاں، وہ باندیاں اگر چہ دوسرے مذہب کی ہوں گی، ان سے بھی پردہ نہیں ہے۔ اور بعض ائمہ نے فرمایا کہ اگر غلام بھی ہوں گے تو ان سے پردہ نہیں ہے۔

ازواجِ مطہرات کی احتیاط:

'وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ۔' اور اللہ سے ڈرو۔ یہ خطاب ازواج مطہرات سے ہے۔ یہ حضرات اتنی محتاط تھیں کہ ایک صاحب حضرت افلح تھے، یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے رضاعی چچا تھے، ان کے والد حضرت صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت افلح نے ایک ماں کا دودھ پیا تھا، تو دونوں رضائی بھائی تھے اور کوئی رشتہ نہیں تھا۔ رضاعت کا رشتہ بھی نسب کے رشتے کی طرح قرآن کی رو سے معتبر ہوتا ہے۔ تو حضرت افلح آئے اور حضرت عائشہ سے ملنا چاہا تو حضرت عائشہ نے منع کر دیا کہ 'نہیں، آپ کو آنے کی اجازت نہیں۔' پھر حضور ﷺ تشریف لائے تو حضرت عائشہ نے عرض کیا کہ میرے رضاعی چچا تھے، ملنے آنا چاہتے تھے تو میں نے ان کو منع کر دیا۔' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ 'کیوں منع کر دیا؟ رضاعی چچا سے پردہ نہیں، ان سے نکاح کی اجازت نہیں ہے، ان کو بلالو۔' جب حضور ﷺ نے اجازت دیدی تب ملاقات کی۔ [بخاری: ۵۱۰۳]

ان حضرات نے بہت ہی احتیاط کی، کبھی بھی کسی غیر محرم کو اپنے پاس آنے کی اجازت نہیں دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے صحابہ آتے تھے، صحابہ کے علاوہ بھی اور لوگ آتے تھے، مگر جو کچھ ہوتا تھا پردے کے اندر سے ہوتا تھا، کبھی کسی کے سامنے حضرت عائشہ نہیں آئیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے دو بھانجے تھے۔ بھانجے تو کئی ایک تھے، مگر دو

بھانجے حضرت عبداللہ ابن زبیر اور حضرت عروہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما بہت خاص بھانجے تھے۔ یہ دونوں ان کے پاس جاتے تھے اور جا کر ان سے باتیں کرتے تھے۔ ان کے ذریعہ سے باتیں دوسروں تک پہنچائی جاتی تھی، مگر کبھی کسی کو سامنے آنے کی اجازت نہیں دی۔ حضور ﷺ کے وصال کے بعد مدت دراز تک زندہ رہیں مگر کسی کو سامنے آنے کی اجازت نہیں دی۔ آگے فرمایا:

'اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدًا'۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نگراں ہے، دیکھنے والا ہے، سارے کام اس کے سامنے ہو رہے ہیں، اس لیے اہتمام کرو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کی جو عنایات اور جو خصوصی کرم ہے اور اللہ کے ساتھ جو خصوصی بات ہے وہ اس آیت میں بیان فرماتے ہیں: 'اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِىِّ۔' بے شک اللہ اور اللہ کے سب فرشتے نبی پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں۔

فرشتوں کی تعداد لا متناہی ہے:

صلوٰۃ کے معنی آتے ہیں دعا کے، مہربانی کے۔ اللہ اور فرشتے دونوں کی طرف نسبت ہے تو معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی مہربانی نبی کے ساتھ ہے اور تمام فرشتوں کی خصوصی دعائیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہیں۔ فرشتوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ایک ادنیٰ بات بتاتا ہوں۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ 'جب معراج میں تشریف لے گئے تھے، وہاں حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام بیت المعمور سے ٹیک لگائے بیٹھے ہوئے تھے۔ جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ 'یہ بیت المعمور ہے، یہ فرشتوں کا قبلہ ہے، فرشتوں کی عبادت گاہ ہے اور ٹھیک اسی کے نیچے خانۂ کعبہ ہے۔ اس میں ہر روز ستّر ہزار فرشتوں کو داخلے کی اجازت ملتی ہے، اور وہ اللہ کی عبادت کرتے ہیں، پھر وہ نکل آتے ہیں اور دوبارہ ان کو داخل ہونا نصیب نہیں ہوتا۔' اتنی بڑی تعداد ہے کہ ہر روز ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں اور جو ایک مرتبہ داخل ہو گیا اس کو دوبارہ داخلہ نصیب نہیں ہوتا۔

ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ 'کیا مولانا! آپ لوگ ہر بات میں فرشتوں کو لے کر آتے ہیں، اتنے لوگ مرتے ہیں، برسات میں اتنے کیڑے مرتے ہیں تو کیا اتنے فرشتے ہیں جو ہر کیڑے کی روح نکالتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ نے کیڑوں کو دیکھا ہے، اللہ کی فوج کو نہیں دیکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: 'وَمَا یَعۡلَمُ جُنُوۡدَ رَبِّکَ اِلَّا ھُوَ'۔ [المدثر: ۳۱] اللہ کے لشکر کو کوئی جانتا ہی نہیں اللہ کے سوا۔ اللہ جانے کتنے فرشتے ہیں! اس لیے یہ ضروری نہیں کہ ہر کیڑے کے لیے الگ فرشتہ آتا ہو، ایک ہی فرشتہ ہو جو تمام کیڑوں کی جان نکال لے، مگر یہ استہزا کرنے والے استہزا کرتے رہیں، بعد میں ان کو ٹھکانہ معلوم ہو جائے گا۔

مشہور ہے کہ ایک صاحب کتا پالے ہوئے تھے، ایک مولوی کا بچہ تھا، اس نے کہا کہ 'صاحب! آپ کتا پالے ہوئے ہیں اور شریعت میں کتا پالنا حرام ہے، اس لیے کہ جہاں کتے ہوتے ہیں، وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔' جواب دیا 'برخوردار! اسی لیے پالا ہے کہ یہ رہے گا تو فرشتے آئیں گے نہیں، اور فرشتے ہی جان نکالتے ہیں تو وہ بھی نہیں آئیں گے۔' برخوردار بھی بہت ذہین تھے کہا 'ارے صاحب! کیا بات کرتے ہیں؟ جو فرشتہ کتے کی جان نکالنے آئے گا، وہی آپ کی بھی نکال لے گا۔'

فرشتوں کی تعداد کوئی نہیں جانتا۔ احادیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ گننا کیا تصور کرنا محال ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ 'اگر کوئی شخص صبح کو اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ السَّمِیۡعِ الۡعَلِیۡمِ مِنَ الشَّیۡطَانِ الرَّجِیۡمِ تین مرتبہ پڑھے اور اس کے بعد سورہ حشر کی آخری آیتیں: ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیۡ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ عَالِمُ الۡغَیۡبِ وَالشَّھَادَۃِ ھُوَ الرَّحۡمٰنُ الرَّحِیۡمُ آخر تک پڑھ لے تو اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ ستّر ہزار فرشتے لگا دیتے ہیں، وہ شام تک اس کے ساتھ رہتے ہیں، اور اگر شام کو پڑھ لے تو پھر صبح تک رہتے ہیں۔ کسے باشد، کوئی پڑھ لے۔ اب انسانوں کی تعداد دنیا میں کتنی ہے؟ ان میں سے جتنے لوگ پڑھ لیں، سب کے ساتھ وہی معاملہ ہے۔ کہاں تک کوئی فرشتوں کی تعداد کا اندازہ لگائے گا۔ اللہ کی مخلوق کا

کوئی اندازہ نہیں کیا جاسکتا، اور کیسے کوئی اندازہ کرسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اگر کسی کو اندازہ ہو تو کرلے۔ احادیث میں، قرآن میں جنت کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں [جنت بھی تو ایک مخلوق ہے] وہ انسانی عقل سے باہر ہے۔

خدا کی قدرت لامحدود ہے:

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ 'دیکھو! تم سبحان اللہ کہو، تم الحمدللہ کہو، تم لا الٰہ الا اللہ کہو، یہ سب جنت کے درخت ہیں، پڑھتے جاؤ جنت میں درخت لگتے جائیں گے۔' سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ مجلس میں موجود تھے، کہا 'حضرت! تب تو ہم بہت لگا لیں گے، پڑھنے والے ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں پڑھتے ہیں۔' تو حضرت نے ارشاد فرمایا 'خدا کی قدرت اس سے بھی زیادہ ہے۔' تم تو محدود ہو انسان کی زبان محدود ہے، انسان کا دماغ محدود ہے، انسان کی سوچ محدود ہے اور اللہ کی قدرت تو لامحدود ہے۔

قدرت کی لامحدودیت کا ایک منظر:

حضرت سعید ابن مسیّب کی روایت ہے کہ وہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ملے تو ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: 'میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اور تم کو جنت کے بازار میں اکٹھا کرے۔' سعید بن مسیّب نے کہا: 'کیا اس میں بازار بھی ہے؟' ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: 'ہاں، مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی کہ جب جنتی جنت میں داخل ہوں گے تو وہ اس میں اپنے اعمال کے مطابق اتریں گے، پھر دنیا کے دنوں میں سے جمعہ کے دن کے برابر انھیں اجازت دی جائے گی تو وہ اپنے رب کی زیارت کریں گے۔ ان کے لیے عرش ظاہر ہوگا اور جنت کے ایک باغ میں نظر آئے گا، پھر ان کے لیے نور کے منبر، موتی کے منبر، یاقوت کے منبر، زمرد کے منبر، سونے کے منبر اور چاندی کے منبر رکھے جائیں گے، ان کے ادنی درجہ والے...... حالاں کہ ان میں کوئی بھی ادنی نہیں ہوگا...... مشک اور کافور کے ٹیلے پر بیٹھیں گے اور دوسرے منبر والوں کے بارے میں یہ نہیں خیال کریں گے کہ وہ ان سے اچھی جگہ بیٹھے ہیں۔' ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: 'میں نے

عرض کیا: 'اللہ کے رسول! کیا ہم اپنے رب کو دیکھیں گے؟' آپ نے فرمایا: 'ہاں، کیا تم سورج اور چودہویں رات کے چاند دیکھنے میں دھکم پیل کیے جاتے ہو؟' ہم نے کہا: 'نہیں،' آپ نے فرمایا: 'اسی طرح تم اپنے رب کا دیدار کرنے میں دھکم پیل نہیں کرو گے۔ اور اس مجلس میں کوئی ایسا آدمی نہیں ہوگا جس کے روبرو اللہ تعالیٰ گفتگو نہ کرے، حتیٰ کہ ان میں سے ایک آدمی سے کہے گا: 'اے فلاں ابن فلاں! کیا تمھیں وہ دن یاد ہے جب تم نے ایسا ایسا کیا تھا؟' پھر اسے اس کے بعض گناہ یاد دلائے گا جو دنیا میں اس نے کیے تھے تو وہ آدمی کہے گا: 'اے میرے رب! کیا تو نے مجھے معاف نہیں کر دیا؟' اللہ تعالیٰ کہے گا: 'کیوں نہیں؟ میری مغفرت کے سبب ہی تم اس مقام پر ہو۔' وہ سب اسی حال میں ہوں گے کہ اوپر سے انھیں ایک بدلی ڈھانپ لے گی اور ان پر ایسی خوشبو برسائے گی کہ اس طرح کی خوشبو انھیں کبھی نہیں ملی ہوگی اور ہمارا رب تبارک وتعالیٰ کہے گا: 'اس کرامت اور انعام کی طرف جاؤ جو ہم نے تمھارے لیے تیار کر رکھی ہے اور اس میں سے جو چاہو لو۔' چنانچہ ہم ایک ایسے بازار میں آئیں گے جسے فرشتے گھیرے ہوں گے، اس میں ایسی چیزیں ہوں گی کہ اس طرح نہ کبھی آنکھوں نے دیکھی ہوگی نہ کانوں نے سنا ہوگا اور نہ کبھی دلوں میں اس کا خیال آیا ہوگا۔ ہم جو چاہیں گے ہمارے پاس لایا جائے گا۔ اس میں خرید وفروخت نہیں ہوگی۔ اور اسی بازار میں جنتی ایک دوسرے سے ملاقات کریں گے۔ آپ نے فرمایا: 'ایک بلند مرتبہ والا آدمی اپنے سے کم رتبہ والے کی طرف متوجہ ہوگا اور اس سے ملاقات کرے گا [حالاں کہ حقیقت میں ان میں سے کوئی بھی کم مرتبے والا نہیں ہوگا] تو اسے [ادنی مرتبے والے کو] اس کا لباس دیکھ کر عجیب سا لگے گا، پھر اس کی آخری گفتگو ختم بھی نہیں ہوگی کہ اسے محسوس ہوگا کہ اس کا لباس اس سے بھی اچھا ہے اور یہ اس وجہ سے ہوگا کہ جنت میں کسی کا مغموم ہونا مناسب نہیں ہے۔ پھر ہم [جنتی] اپنے گھروں کی طرف واپس جائیں گے اور اپنی بیویوں سے ملیں گے تو وہ کہیں گی: 'خوش آمدید! آپ ایسا حسن و جمال لے کر آئے ہیں جو اُس سے کہیں بہتر ہے جب آپ ہم سے جدا ہوئے تھے۔' تو وہ

آدمی کہے گا: 'آج ہم اپنے رب جبار کے ساتھ بیٹھے تھے، اور ہمارا حق ہے کہ ہم اسی طرح لوٹیں جس طرح لوٹے ہیں۔' [ترمذی:۲۵۴۹]

تو یہ ہے قدرت کی لامحدودیت، اس کا اصل نمونہ تو جنت میں دیکھنے میں آئے گا۔

رسول اللہ ﷺ پر اللہ کی خاص مہربانی ہے:

یہ بتا رہا ہوں کہ اللہ نے فرمایا 'اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ۔' اللہ تعالیٰ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام پر رحمت اور مہربانی بھیجتے ہیں۔ یہ وہ مہربانیاں ہیں جو کسی اور پر نہیں ہیں، یہ خاص الخاص مہربانیاں ہیں اور اس کا سلسلہ چلتا رہے گا یہاں تک کہ میدان قیامت میں بھی اس کا سلسلہ ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ 'جب اللہ تبارک وتعالیٰ حساب وکتاب کے لیے میدان حشر میں نزول فرمائیں گے تو حضور ﷺ سے تمام لوگ سفارش کے لیے کہیں گے، آپ سجدے میں سر رکھ دیں گے۔ فرماتے ہیں کہ 'سجدے میں سر رکھ کر اُس دن میں اللہ کی وہ حمد وثنا کروں گا، اللہ کی وہ پاکی، وہ بڑائی بیان کروں گا جس کی آج مجھے خبر نہیں۔ اللہ کی طرف سے وہ باتیں مجھے الہام ہوں گی اور وہ میں کہوں گا۔' یہ بہت بڑی اللہ کی نعمت اور خاص مہربانی ہے، جو حضور ﷺ کو عطا ہوگی۔ آپ حمد وثنا کرتے رہیں گے یہاں تک کہ حق تعالیٰ کی پوری مہربانی جلوہ گر ہو جائے گی اور فرمائیں گے: یامحمد! اے محمد! اِرۡفَعۡ رَاسَكَ۔' اب سجدے سے سر اٹھالو، تمھارا کام پورا ہوگیا، مانگو، کیا مانگتے ہو، دیا جائے گا، سفارش کرو، آج تمھاری سفارش سنی جائے گی۔ تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم عرض کریں گے کہ پروردگار حساب وکتاب کے لیے مخلوق پریشان ہے۔ [بخاری:۴۴۷۶] اس کے بعد حساب وکتاب کا کام شروع ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر اللہ تعالیٰ کی جو مہربانیاں ہیں، وہ اس طرح ظاہر ہوں گی۔

سورہ کوثر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: 'اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰكَ الۡکَوۡثَرَ۔ کوثر کہتے ہیں خیر کثیر کو۔ ایک تو حوض کوثر ہے، وہ تمام خیر کا مجموعہ ہے۔ دوسرے دنیا اور آخرت کے اندر جتنی

بھلائیاں ہوسکتی ہیں، انسان کومل سکتی ہیں، وہ ساری کی ساری آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی ہوئی ہیں، اور آپ نے کہیں بخل نہیں فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں 'اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰہُ یُعْطِیْ۔' [بخاری:۷۱] اللہ نے مجھے دیدیا ہے اور میں بانٹتا ہوں۔ جو بھلائیاں حضور ﷺ کو اللہ کی طرف سے ملی ہیں، ان سب کی تقسیم ہورہی ہے اور سارے عالم اور ساری دنیا پر تقسیم ہورہی ہے۔

بہرحال! حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کی مہربانی ہوتی ہے، اور پھر آسمان کے لاتعداد فرشتے ان کے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں۔ اب اس مرتبہ اور مقام کو کون جان سکتا ہے؟ اس بلندی کو کون جان سکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کس مقام تک پہنچے ہوئے ہیں! اور ان کے لیے اللہ کی کتنی مہربانیاں اور ملائکہ کی کتنی دعائیں لگی ہوئی ہیں!

وہ مرتبہ اور مقام حضور ﷺ کو حاصل ہوا کہ آپ خود فرماتے ہیں کہ 'اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ آدَمَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَلَافَخْرَ۔' [ترمذی:۳۶۱۵] قیامت کے دن اولاد آدم کا سردار میں ہوں، کوئی فخر نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا ایک احسان ہے۔

درود شریف کی فضیلت:

آگے حکم دیتے ہیں: یٰاَیُّھَاالَّذِیْنَ آمَنُوْا صَلُّوا وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔' اے ایمان والو! تم بھی ان پر رحمت بھیجو، یعنی رحمت کی دعائیں کرو اور سلام بھیجو۔

صلاۃ وسلام وہی ہے جس کو ہم اردو میں درود شریف کہتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف بھیجنے کا حکم اللہ نے دیا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ: اَلْبَخِیْلُ الَّذِیْ مَنْ ذُکِرْتُ عِنْدَہُ فَلَمْ یُصَلِّ عَلَیَّ۔ [ترمذی:۳۵۴۶] کسی کے سامنے میرا ذکر ہو، اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے تو وہ بخیل ہے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ: رَغِمَ اَنْفُ رَجُلٍ ذُکِرْتُ عِنْدَہُ، فَلَمْ یُصَلِّ عَلَیَّ۔ [ترمذی:۳۵۴۵] اس شخص کی ناک خاک آلود ہو جس کے پاس میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے۔

اس درود بھیجنے کا جو فایدہ حضور ﷺ کو ہوگا وہ تو ہے ہی، درود بھیجنے والے کا بھی بہت

فائدہ ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ وَاحِدَۃً صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ عَشْرًا۔ [نسائی: ۱۲۹۷] جو مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجے گا اللہ اس پر دس مرتبہ رحمت بھیجے گا۔ ایک روایت میں ہے: مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ صَلوۃً وَاحِدَۃً صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ عَشَرَ صَلَوَاتٍ وَ حُطَّتْ عَنْہُ عَشَرُ خَطِیْئَاتٍ وَ رُفِعَتْ لَہُ عَشَرُ دَرَجَاتٍ۔ جو مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے، اللہ تعالی اس پر دس مرتبہ رحمت بھیجتا ہے اور اس کے دس گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں اور اس کے دس درجات بلند کر دیے جاتے ہیں۔ صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب دو تہائی رات گزر جاتی تو رسول اللہ ﷺ فرماتے 'لوگو! اللہ کو یاد کرو، اللہ کو یاد کرو، موت اپنی فوج لے کر آ گئی ہے۔' میں نے عرض کیا 'یا رسول اللہ! میں آپ پر بہت درود پڑھا کرتا ہوں، سو اپنے وظیفے میں آپ پر درود پڑھنے کے لیے کتنا مقرر کر لوں؟' آپ نے فرمایا 'جتنا چاہو۔' میں نے عرض کیا 'ایک چوتھائی آپ پر درود متعین کر دوں؟' آپ نے فرمایا 'ہاں بہتر ہے، اس سے بھی زیادہ کرلو تو بہتر ہے۔' تو کہا 'حضرت! آدھا کر دیتا ہوں۔' فرمایا 'ہاں بہتر ہے، اس سے بھی زیادہ کرو تو بہتر ہے۔' کہا 'حضرت! اگر اجازت ہو تو تین چوتھائی کرلوں۔' فرمایا 'ہاں بہتر ہے، اس سے بھی زیادہ کرو تو بہتر ہے۔' تو عرض کیا 'حضرت! سارا وظیفہ درود ہی کا کر دوں۔' فرمایا 'ہاں، سارا وظیفہ درود کا کرلو۔' تو آپ نے فرمایا کہ 'اب یہ درود تمھارے سب غموں کے لیے کافی ہوگا اور اس سے تمھارے گناہ بخش دیے جائیں گے۔'

[ترمذی: ۲۴۵۷]

ایک اللہ والے کا واقعہ:

ابھی پچھلے سال حج میں مدینہ طیبہ میں ہماری حاضری ہوئی تھی۔ ایک بزرگ سے ہماری ملاقات مدینہ طیبہ میں ہوتی تھی، بہت زبردست آدمی تھے۔ اس مرتبہ جس دن ہم مدینہ پہنچے، اُسی دن ان کا انتقال ہوگیا۔ جنازے میں شرکت کی سعادت ملی۔ بہت ہی

عجیب وغریب بزرگ تھے۔ رہنے والے ہندوستان ہی کے تھے، مگر دس سال کی عمر میں مدینہ چلے گئے تھے، وہیں رہ گئے، لوٹ کے آئے نہیں۔ اس قدر ان پر استحضار رہتا تھا کہ ہم تو حیران تھے۔ ان کے پاس بیٹھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈائرکٹ سب کو جنت میں لے کر چلے جائیں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ 'حضرت! آپ بہت کمزور ہوگئے ہیں'۔ کہنے لگے 'یہاں کمزور دیکھ رہے ہو، وہاں جا کر چھلانگیں لگاؤں گا'۔ بیمار پڑے ہوئے تھے۔ ہمارے ایک دوست نے پیر دبانا چاہا تو کہا 'چھوؤ مت'۔ کہا 'نہیں حضرت دبائیں گے'۔ کہا 'مت چھوؤ'۔ اب یہ اصرار کررہے ہیں اور وہ منع کررہے ہیں کہ مت چھوؤ، پورے پاؤں میں پھوڑا ہے، کہیں ہاتھ رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔ پھر انھوں نے بتایا کہ 'ایک دن میں نے مسجد نبوی سے نکلتے ہوئے دعا کی کہ 'پروردگار! بہت دن جی لیا، اب کتنا جیوں گا؟ اب دنیا سے لے چلیے'۔ جب میں یہ دعا کررہا تھا تو اُدھر سے حکم ہوا کہ 'ابھی نہیں، ابھی تو تمھارا درجہ بڑھانا ہے'۔ جب یہ کہا تو ہم سمجھ گئے کہ پھوڑا نکلے گا اور درجہ بڑھے گا۔ چنانچہ اسی دن پھوڑا نکلا ہے، سال دوسال ہوگئے پورے پاؤں میں پھوڑا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا 'آپریشن'۔ کہا 'نہیں، آپریشن مت کرو، دوا کردو، مگر آخر میں آپریشن کرانے گئے تو آپریشن ہوا نہیں، ان کا انتقال ہوگیا۔

درود شریف کی تاکید:

ایک مرتبہ میں ان کی خدمت میں پہنچا، وہ ایسے ہی بیٹھے ہوئے تھے، جیسے ہی میں پہنچا کہنے لگے 'مولوی صاحب! درود شریف میں بہت برکت ہے، جتنا پڑھ سکو پڑھو'۔ میں بہت حیران ہوا، بغیر کسی ظاہری تمہید کے درود شریف کی بات شروع کردی، پھر مجھے یاد آیا کہ 'میں درود شریف کی ایک مقدار پڑھا کرتا تھا، بعض اور چیزیں پیش آگئیں تو درود شریف کی مقدار گھٹادی، تو وہاں پہنچا تو انھوں نے کہا کہ 'درود شریف بہت پڑھا کرو'۔ میں سمجھ گیا کہ ان کا اشارہ ہے کہ جو درود شریف گھٹائے ہو، اُس کو گھٹاؤ مت، اس کو پورا کرو۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ’بیٹے ! درود شریف بہت پڑھا کرو، ہم کو جو کچھ ملا ہے درود شریف کی برکت سے ملا ہے۔ یہ ایسی چیز ہے کہ آخرت تو آخرت ہے، دنیا میں اس کے فوائد بہت ہیں۔

درود شریف سے متعلق ایک پنڈت کا تجربہ:

ہمارے ایک دوست ہیں قاری شبیر صاحب، نابینا ہیں۔ وہ کہنے لگے کہ ’ہم غازی آباد اسٹیشن پر بیٹھے ہوئے تھے، بغل میں ایک اور آدمی بیٹھا ہوا تھا اور وہ مسلسل درود شریف پڑھے جا رہا تھا‘ یہ نابینا تھے، دیکھ تو سکتے نہیں تھے، لیکن سنا کہ درود شریف بہت انہماک سے پڑھے جا رہا ہے۔ پوچھا کہ ’آپ کا نام کیا ہے؟‘ تو کہا کہ ’میں فلاں پنڈت ہوں‘۔ یہ بہت حیران ہوئے، کہا کہ ’آپ پنڈت ہیں؟ ہندو ہیں؟‘ کہا ’ہاں میں پنڈت ہوں‘۔ ’تو پھر آپ یہ درود شریف پڑھ رہے ہیں‘۔ کہا ’ارے صاحب! میں اس کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا، روزانہ ایک ہزار مرتبہ پڑھتا ہوں، اس سے کم کبھی نہیں پڑھتا۔‘ ’تو آپ اسے کیوں پڑھتے ہیں؟‘ کہا کہ ’میں ایک بڑا کاروباری ہوں۔ ایک مرتبہ کاروبار میں بڑا نقصان ہوا۔ ایک مولوی صاحب سے میری دوستی تھی، میں نے ان سے ذکر کیا کہ ’بھائی! میرا بڑا نقصان ہوا ہے‘۔ انھوں نے مجھ کو یہی درود شریف پڑھنے کو بتا دیا کہ اس کو پڑھا کیجیے، آپ کا کاروبار ٹھیک ہو جائے گا۔ ایک ہزار مرتبہ انھوں نے بتایا تھا اور میں روز پڑھتا ہوں، اور اس کے بعد جو میرا کاروبار چلا تو کبھی گھاٹا ہوا ہی نہیں۔ میں تو کسی حال میں اس کو نہیں چھوڑتا۔‘

ایک غیر پڑھتا ہے تو بہت برکت پاتا ہے، اپنا جب پڑھے گا اور حضور ﷺ سے محبت اور عقیدت کے ساتھ پڑھے گا تو اللہ کی کتنی رحمتیں آئیں گی، اس پر کتنا پیار آئے گا، اللہ کی کتنی مہربانی ہوگی۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلیٰ آلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّد وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ۔ یہ الفاظ حضور ﷺ نے ارشاد فرمائے ہیں، ان میں بڑی برکت ہے۔ آدمی اپنی

زندگی کا ایک حصہ ضرور درود شریف کے لیے متعین کردے، پھر اس کے فایدے دیکھے، دنیا کے اندر بھی اور آخرت کے اندر بھی۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالمین

❑❑❑

درسِ قرآن

[جامع مسجد شہر اعظم گڑھ]

درود شریف ایک ایسی دعا ہے جو کبھی رد نہیں ہوتی

الحمدلله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله وصحبه اجمعين۔

اَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَآئِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۵۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُهِيْنًا ﴿۵۷﴾ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَاِثْمًا مُبِيْنًا ﴿۵۸﴾ يَا اَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِاَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰى اَنْ يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَحِيْمًا ﴿۵۹﴾ لَئِنْ لَمْ يَنْتَهِ الْمُنَافِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَرَضٌ وَالْمُرْجِفُوْنَ فِى الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَا اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۰﴾ مَلْعُوْنِيْنَ اَيْنَمَا ثُقِفُوْا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ﴿۶۱﴾

بے شک اللہ اور اس کے فرشتے رسول پر رحمت بھیجتے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی ان پر رحمت بھیجو اور سلام بھیجو۔

دعا کرنے کا طریقہ:

اس آیت کے سلسلہ میں میں نے پچھلے ہفتہ کچھ عرض کیا تھا۔رسول اللہ ﷺ اللہ کے مقبول بندے ہیں،ان کے لیے جب دعا کی جائے گی تو وہ ان کی مقبولیت میں اضافہ کرے یا نہ کرے ،دعا کرنے والے کی مقبولیت کا سبب ضرور ہوگی۔اسی لیے ایک صاحب کو رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ مختصر سی دعا کی اور اٹھ کر چل دیے،آپ ﷺ ارشاد فرمایا کہ'اس طرح سے دعا نہیں کرنی چاہیے۔دعا کے لیے پہلے اللہ کی حمد وثنا بیان کرو، اس کی تعریف کرو،اس کے بعد مجھ پر درود بھیجو،اس کے بعد جو دعا کرنی ہے کرو۔ [ابوداؤد:۱۴۸۱]

اللہ کی حمد وثنا کرنا بڑی عبادت ہے:

اللہ کی حمد وثنا کرنا بڑی عبادت ہے، بلکہ دعا کا یہی آغاز ہے۔جس سے کوئی چیز طلب کی جاتی ہے،اس کی آؤ بھگت کی جاتی ہے،اس کی تعریف میں رطب اللسان ہوا جاتا ہے، جب کہ حقیقت میں اللہ ہی تمام تعریفوں کے مستحق ہیں،تمام خوبیاں اور کمالات انھیں کے واسطے سے ہیں،تو یقیناً وہ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ ان کی حمد وثنا کی جائے، ان کی تعریف میں رطب اللسان ہوا جائے۔چنانچہ اللہ نے جب انسانوں کو پیدا کرنا چاہا تھا تو فرشتوں سے کہا تھا کہ' اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً۔' [البقرہ:۳۰] میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔تو فرشتوں نے اس کے جواب میں جو بات کہی تھی وہ یہ تھی: قَالُوْا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ۔ [البقرہ:۳۰] جس کو آپ پیدا فرمائیں گے،وہ خوں ریزیاں کرے گا،ظلم کرے گا،ہم تو آپ کی تحمید وتقدیس کے لیے،آپ کی پاکی بیان کرنے کے لیے کافی ہیں۔لیکن اللہ کے سامنے اور بھی حکمتیں تھیں جس کی وجہ سے انسان کو پیدا کیا۔

بہر حال! یہ بڑی عبادت ہے کہ اللہ کی حمد وثنا کی جائے۔دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اسی کے کرنے سے ہوتا ہے،چاہے ہماری مرضی کے موافق ہو یا خلاف! یہ ہماری ذمہ

داری ہے کہ جو کچھ ہو، ہم اس پر اللہ کی حمد وثنا کریں۔ وہ عزت والا ہے، قابل تعریف ہے۔

درود ایسی دعا ہے جو رد نہیں ہوتی:

دعا سے پہلے اللہ کی حمد بیان کی جائے، اس کے بعد جناب نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجا جائے۔ حمد کی طرح درود بھی ایک دعا ہے، نیز درود وہ دعا ہے جو رد نہیں ہوسکتی، وہ ہر حال میں قبول ہوگی۔ اس لیے کہ دعا کرنے والا جب نبی ﷺ پر درود اور رحمت بھیجتا ہے تو آپ ﷺ تک رحمت کا پہنچنا اور قبول ہونا یقینی ہے، اور جب یہ قبول ہوگئی تو اس کے بعد آدمی اپنے مقصد کے لیے جو چیز مانگے گا، اللہ اسے بھی قبول فرمائیں گے۔

درود پڑھنا واجب ہے:

دوسری بات یہ عرض کرنی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا ذکر جس مجلس میں آئے، اس مجلس میں ایک مرتبہ درود شریف پڑھنا واجب ہے، اس کے بعد جب متعدد بار آئے تو واجب تو نہیں، لیکن بہتر یہ ہے کہ آدمی آہستہ سے درود پڑھ لے۔ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کہہ لے، بالکل نہیں پڑھا تو مواخذہ ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ 'جس آدمی کے سامنے میرا نام آیا اور اس نے مجھ پر درود نہیں بھیجا، اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو۔ [ترمذی: ۳۵۴۵] ایسے ہی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: 'بخیل وہ شخص جس کے سامنے میرا ذکر ہو، اور اس کو اتنی بھی توفیق نہیں ہو کہ میرے اوپر درود بھیجے، رحمت کی دعا کرے۔ [ترمذی: ۳۵۴۶]

اس بنیاد پر جب کسی مجلس میں ہوں اور رسول اللہ ﷺ کا نام گرامی آئے تو ایک مرتبہ درود اور رحمت بھیجنا واجب ہے۔ یہ مسئلہ بعینہٖ سجدۂ تلاوت کی طرح ہے کہ آدمی ایک مجلس میں بیٹھا ہو اور ایک آیتِ سجدہ کئی مرتبہ پڑھے یا سنے تو ایک مرتبہ سجدہ کرنا واجب ہوگا، اگر ہر مرتبہ الگ الگ کرے تو بھی ٹھیک ہے۔

بہر حال! ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک نماز میں درود شریف

پڑھنا سنت مؤکدہ ہے،اور امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک درود کا پڑھنا واجب ہے۔اگر کسی نے نماز میں درود نہیں پڑھا تو اس کی نماز نہیں ہوگی۔اور اس چیز کو خود رسول اللہ ﷺ نے سکھایا ہے۔صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ 'آپ کے اوپر صلاۃ بھیجنے کا حکم ہے،اور سلام بھی بھیجنے کا حکم ہے۔سلام کا بھیجنا تو ہم کو معلوم ہے کہ التحیات پڑھتے ہوئے ہم آپ پر سلامتی بھیجیں کہ :اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُه۔'سلامتی ہو آپ پر اے اللہ کے نبی!اور اس کی رحمت و برکت ہو۔

درود نام ہے رسول اللہ ﷺ پر رحمت کی دعا کا:

لیکن ہم آپ پر درود کیسے بھیجیں؟ یہ آپ بتا دیجیے،حالاں کہ اللہ نے مطلقاً فرمایا ہے 'صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔'ان پر صلوۃ بھیجو،یعنی رحمت بھیجو۔چنانچہ رحمت کی دعا جن جن لفظوں میں کی جائے گی،وہ درود ہے،اس کے لیے چاہے جو بھی الفاظ اختیار کریں۔صحابہ کرام کا یہ معمول تھا کہ ہر بات کو رسول اللہ ﷺ سے حاصل کرنا چاہتے تھے،ان کی یہ تمنا ہوئی کہ رحمت اور درود کے الفاظ ہم خود جناب نبی اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے سنیں،تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کہو:اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى آلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَجِيْدٌ الخ۔'اس کو ہمارے عرف میں درود ابراہیمی کہتے ہیں۔چوں کہ نبی کریم ﷺ نے اس کی تعلیم فرمائی ہے،اس لیے نماز میں اس کا پڑھنا افضل ہے،اس کے علاوہ اگر کوئی اور درود پڑھ لیا تو نماز ہو جائے گی۔نماز میں درود پڑھنا سنت مؤکدہ ہے،چوں کہ آپ ہی کے واسطہ سے ہمیں نماز ملی ہے،اس لیے یہ آپ کا حق ہے،اس کے بغیر نماز،نماز نہیں ہے۔

کیا رسول اللہ ﷺ بھی درود پڑھتے تھے:

پچھلے ہفتہ ایک صاحب پوچھ رہے تھے کہ ہم کو تو درود پڑھنے کا حکم ہے تو کیا یہی حکم حضور ﷺ کے لیے بھی ہے؟ ایسے ہی ایک سوال اور ذہن میں آتا ہے کہ ہمیں ایمان لانے کا اور رسول اللہ کی رسالت کی گواہی کا حکم ملا ہے،ہمارے لیے حکم ہے اَشْهَدُ أَنَّ

مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰہِ کا[میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں] تو کیا یہی حکم رسول اللہ ﷺ کے لیے بھی ہے؟ آپ بھی گواہی دیں گے کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ تو یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ ایمان لانے کا فریضہ سب سے پہلے آپ ﷺ پر عاید ہوتا ہے، چوں کہ آپ اللہ کی طرف سے بھیجے گئے ہیں، تو پہلے خود ہی ایمان لائیں گے کہ میں اللہ کا رسول ہوں، تب دوسرے سے کہیں گے۔ چنانچہ آپ یہ کہتے تھے: اَشْھَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کا بندہ اوراس کا رسول ہے۔ اس رسالت کی گواہی سب سے پہلے آپ نے دی ہے، پھر لوگوں پر یہ فریضہ عاید ہوا کہ وہ رسول اللہ کی رسالت کی گواہی دیں۔ ایسے ہی مسئلہ درود کا بھی ہے۔ پہلے آپ نے خود اسے پڑھا ہے: اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ۔ اے اللہ! رحمت ہو محمد پر۔ اوراس کے لیے آپ متکلم کا صیغہ استعمال نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ یہ نہیں کہتے تھے کہ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَیَّ۔ یہ درود جیسے امت کے افراد پڑھتے ہیں، خود حضور ﷺ بھی پڑھتے تھے، اور یہ درود تو فرشتوں پر بھی لازم ہے، فرشتے بھی رحمت کی دعا کرتے ہیں، اورانھیں الفاظ میں کرتے ہیں۔

درود ابراہیمی کے علاوہ حدیث شریف میں اور بہت سے الفاظ منقول ہیں۔ علما نے چالیس یا اس سے زاید الفاظ جمع کیے ہیں جن میں درود کا بھیجنا افضل ہے۔ اس لیے کہ یہ الفاظ وہ ہیں جو حضور ﷺ کی زبان مبارک سے نکلے ہیں۔ اور یہ بات جگ ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کی زبان مبارک سے ادا ہو جانے کے بعد وہ سب اللہ کی طرف سے ہو گیا۔ کیوں کہ آپ کا ہر کلام اللہ کی طرف سے ہے۔

وحی کی قسمیں:

ایک مرتبہ یہ بات ذکر کی تھی کہ وحی دو طرح کی ہے: وحیِ متلو اور وحیِ غیر متلو۔ بعض مرتبہ الفاظ کے ساتھ وحی آتی تھی، تو یہ قرآن کریم ہے، اوراسی کو وحیِ متلو کہتے ہیں۔ اور دوسری قسم وہ ہے کہ آپ پر معانی نازل ہوتے تھے، اوراسے آپ اپنے الفاظ میں ادا کرتے تھے، جسے ہم حدیث کہتے ہیں، وہ سب اسی قسم میں داخل ہیں اوراسی کو وحیِ غیر متلو

کہتے ہیں۔ چنانچہ حدیث میں جتنے کلام اور دعائیں ہیں، وہ سب کے سب من جانب اللہ ہیں ۔اس لیے جو الفاظ اور کلمات حضور ﷺ کی زبانِ مقدس سے ادا ہوئے ہیں، ان کی شان کچھ اور ہے، اور جو ہم اپنے الفاظ میں درور بھیجتے ہیں گو کہ درود ہو جائے گا، اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن معاملہ کچھ اور ہوگا۔ اسی لیے بعض بزرگوں نے اس کو بڑی اہمیت دی ہے کہ آدمی درود بھیجے یا اپنے لیے دعائیں کرے، تو اس بات کا اہتمام کرے کہ الفاظ وہی ہوں جو رسول اللہ ﷺ سے منقول ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کو جامع دعا پسند ہے:

حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ یَسْتَحِبُّ الْجَوَامِعَ مِنَ الدُّعَاءِ وَیَدَعُ مَاسِوٰی ذَالِكَ۔ [ابوداؤد:۱۴۸۲] رسول اللہ ﷺ جامع دعائیں پسند فرماتے تھے اور جو دعا جامع نہ ہوتی اسے چھوڑ دیتے۔

اب دیکھیے اللہ نے ایک دعا تعلیم فرمائی: رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارَ۔ [البقرہ:۲۰۱] یہ جامع ترین دعا ہے۔ مختصر الفاظ میں دنیا اور آخرت کی بھلائی بھی مانگ لی اور جہنم کی آگ سے پناہ بھی۔ حضور اکرم ﷺ کی اکثر دعا یہی ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ روایتوں میں ہے کہ جب آپ طواف کرتے اور حجر اسود اور رکن یمانی والے گوشے کے برابر پہنچتے تو آپ اسی دعا کو پڑھتے: رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارَ۔

خانہ کعبہ کے چار گوشے ہیں: ایک وہ جس پر حجر اسود ہے، اور ایک اس کے برابر میں، جسے رکن یمانی کہتے ہیں۔ یہ دونوں گوشے اپنی اصل پر ہیں۔ اور دوسری طرف کے دونوں گوشوں میں سے ایک کو رکن عراقی اور دوسرے کو رکن شامی کہتے ہیں۔ یہ دونوں گوشے بنیادِ ابراہیمی سے ہٹ کر بنے ہیں۔ اسلام سے پہلے کفار کے زمانہ میں خانہ کعبہ میں آگ لگ گئی تھی، تعمیرِ نو کے لیے اس قدر مال نہیں تھا کہ پرانی بنیاد پر عمارت کھڑی کرتے، اس لیے اسے چھوٹا کر دیا گیا۔ چنانچہ حطیم کا حصہ باہر ہے، حالاں کہ وہ بھی خانہ

کعبہ کا جز ہے۔

بہر حال! ایسے ہی مختصر مختصر الفاظ میں بہت سی ایسی جامع دعا سکھا دی ہے کہ اگر آدمی ان کو دل سے دہراتا رہے تو اسے کسی اور دعا کی ضرورت ہی نہ پڑے۔

ایک جامع ترین دعا اور اس کی تشریح:

چنانچہ حضور ﷺ کی ایک جامع ترین دعا بتاؤں، آپ جب وضو کرتے تھے تو درمیان میں اور بعد میں ایک دعا پڑھتے تھے: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ ذَنْبِیْ وَوَسِّعْ لِیْ فِیْ دَارِیْ وَبَارِكْ لِیْ فِیْ رِزْقِیْ۔ صرف تین جملے کی دعا ہے۔

پہلا جملہ ہے: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ ذَنْبِیْ۔ اے اللہ! میرے گناہ کو معاف کردے۔ یہ گناہ کی نحوست ہی ہوتی ہے کہ بہت سی بلائیں آتی ہیں، گناہوں کی معافی ہوگئی تو بلائیں ختم ہوجائیں گی۔

اور دوسرا جملہ ہے: وَوَسِّعْ لِیْ فِیْ دَارِیْ۔ اور میرے گھر میں وسعت عطا فرما۔ گھر میں وسعت کا مطلب ایک تو ظاہری ہے کہ اچھا خاصا، لمبا چوڑا، وسیع گھر مل جائے۔ یہ بھی اچھا ہے، اس لیے کہ چھوٹا گھر بہت سے مسائل پیدا کرتا ہے، بڑا گھر ہوگا تو کشادگی رہے گی، لیکن اس کا اصل مطلب یہ ہے میرے گھر میں مجھے وسعت عطا فرمایئے۔ یعنی گھر میں رہ کر کسی قسم کی تنگی محسوس نہ کروں، نہ روزی کی تنگی، نہ بیماریوں کی تنگی، نہ حالات کی تنگی۔ غرض کسی قسم کی تنگی اپنے گھر میں میں محسوس نہ کروں۔ آدمی اپنے گھر میں مطمئن رہے تو اس کو چھوڑ کر جانے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہو۔ روزی فراوانی کے ساتھ اتر رہی ہے، اولاد فرماں بردار ہے، ازواج بہت اچھے ہیں، گھر کے اندر آئے تو فرحت محسوس کرے۔ گھر کی تنگی یہ ہوتی ہے کہ آدمی گھر کے اندر گیا تو دیکھا بیوی بیمار ہے، بچے پریشان ہیں، طبیعت گھبرا جاتی ہے، یا لڑائی جھگڑا ہے، آپس میں اختلاف ہے۔ یہ بھی گھر کی تنگی ہے۔ آدمی گھر میں جا کر پریشان ہوجاتا ہے۔ اے اللہ! میرے گھر میں وسعت عطا فرمادیئے۔ لفظ بہت مختصر ہے، لیکن معنی بہت وسیع اور جامع ہے، سارے

جہاں کا اطمینان اس ایک لفظ میں موجود ہے۔

تیسرا جملہ ہے: وَبَارِكْ لِيْ فِيْ رِزْقِيْ۔ اور میری روزی میں برکت عطا فرمائیے۔ روزی جو مجھے آپ نے دی ہے، اس میں برکت ڈال دیجیے۔ روزی میں برکت آتی ہے تو تھوڑے میں بہت کام ہو جاتا ہے۔ اس روزی سے کوئی پریشانی نہیں آتی۔ ہم میں سے ہر ایک کو تجربہ ہوگا کہ بہت مرتبہ مال اپنے ساتھ پریشانی لے کر آتا ہے، یہ روزی میں برکت نہ ہونے کی دلیل ہے۔ گھر میں غلہ آیا، صاف کر کے رکھ دیا گیا، کچھ دنوں کے بعد دیکھا تو گھن لگ گیا، غلہ خراب ہو گیا، برکت ختم ہو گئی۔ رزق میں برکت یہ ہے کہ آدمی غلہ لایا اور رکھ دیا، کام چلاتا رہا، نہ گھن لگا نہ غلہ خراب ہوا۔

ابھی میں اپنے ایک سلسلہ وار مضمون ''تہجد گذار بندے'' لکھنے کے لیے ایک بزرگ کے بارے میں پڑھ رہا تھا، ان کے یہاں برکت کا انداز کچھ ایسا تھا کہ ایک مرتبہ غلہ لائے اور رکھ دیا اور اس میں سے نکال نکال کر پکاتے رہے، مدتوں پکتا رہا، اور جب ایک دن دیکھا کہ ختم ہی نہیں ہو رہا ہے تو نکال کر تولا، جب وزن کیا تو معلوم ہوا کہ جتنا لائے تھے اس سے کہیں زیادہ تھا، مگر تولنے کے بعد ختم ہو گیا، نہ تولا ہوتا تو اللہ جانے کب تک چلتا۔ اسی لیے ہم لوگ جب چھوٹے تھے تو ہم سے کہا جاتا تھا کہ روٹی مت گننا، گنو گے تو برکت ختم ہو جائے گی۔ الغرض ایک مومن کا کام گنتی سے نہیں چلتا، اس کے پاس کتنا ہے، یہ معنی نہیں رکھتا، اس میں کتنی برکت ہو رہی ہے، کام اس سے چلتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر آدمی اپنے لیے یہی ایک دعا لازم پکڑ لے تو اس کے دنیا کے سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ بڑی جامع دعا ہے۔

ایک اور جامع دعا:

ایسی ہی ایک اور جامع دعا آپ کو بتاؤں۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اَللّٰهُمَّ اَعْطِ نَفْسِيْ تَقْوٰهَا وَزَكِّهَا أَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكّٰهَا أَنْتَ وَلِيُّهَا وَمَوْلَاهَا۔ اس دعا میں بھی تین ہی جملے ہیں: اے اللہ! میرے نفس کو تقوی عطا فرما۔ میرے نفس کو ایسی

صلاحیت، استعداد اور قوت عطا فرما جس سے وہ گناہوں سے بچ جائے۔ وَزَكِّهَا أَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكّٰهَا۔ اور ہمارے گناہوں سے جو نفس پر نجاست لگی ہے، اس کو پاک کر دیجیے صاف کر دیجیے۔ أَنْتَ وَلِيُّهَا وَمَوْلَاهَا۔ آپ ہی اِس نفس کے ولی ہیں، ذمہ دار ہیں، اس کے آقا ہیں۔ ہم نے اپنا نفس آپ کے حوالہ کر دیا، اپنی طبیعت آپ کے سپرد کر دی، اب آپ اس کو درست کر دیجیے۔ تین جملوں کی یہ دعا بے انتہا جامع ہے۔ مجھ سے جب کوئی کہتا ہے کہ کوئی دعا بتا دیجیے تو میں یہی بتا تا ہوں۔ ایک صاحب نے اپنا تجربہ بھی بیان کیا کہ بہت فایدہ ہو رہا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں کا اس میں فایدہ ہے۔ حضور ﷺ نے بہت جامع دعائیں کی ہیں اور ان دعاؤں کا دہرانا اپنی زبان سے بڑی سعادت کی بات ہے۔

دعا میں ہمارا جی نہیں لگتا، اس لیے کہ بڑی بے دلی سے کرتے ہیں، حالاں کہ رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: وَاعْلَمُوا اَنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَجِيْبُ دُعَاءً مِنْ قَلْبٍ غَافِلٍ لَاهٍ۔ [مشکوۃ: ۲۲۴۱] جان لو کہ اللہ تعالیٰ قلب غافل سے کی گئی دعا قبول نہیں فرماتا۔ غفلت سے دعا کی جاتی ہے تو قبول نہیں ہوتی۔ پورے استحضار کے ساتھ دعا قبولیت کے درجہ تک پہنچتی ہے، اور آدمی مسلسل کوشش کرتا رہے تو استحضار پیدا ہو جاتا ہے۔

میں کہنا یہ چاہ رہا تھا کہ درود کے وہ الفاظ جو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمائے ہیں، وہ بہت بہتر اور بہت جامع ہیں، مگر آدمی کے لیے ان کے علاوہ دوسرے الفاظ میں بھی درود بھیجنا جائز ہے۔ چنانچہ اکابر نے درود کے الفاظ تجویز فرمائے ہیں، جو اگر چہ حدیث میں نہیں ہے، مگر حدیث ہی کی روشنی میں ہے۔ اگر ان کو کوئی پڑھتا ہے تو گناہ گار اور خطا کار نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اللہ نے مطلق فرمایا ہے: يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ اے ایمان والو! ان پر درود اور سلام بھیجو۔

نبی کو تکلیف پہنچانے والا لعنتی ہے:

پھر فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ

وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُهِينًا۔ پہلے یہ ذکر آیا تھا کہ نبی کے گھر میں جب داخل ہونا ہوتو بغیر اجازت کے مت جاؤ، کھانے کی دعوت دی جائے تو کھانے کے بعد دیر تک بیٹھ کر باتیں مت کیا کرو۔اس سے نبی کو ایذا پہنچتی ہے۔ یہ ایذا پہنچانا غیر اختیاری ہے، کسی نے یہ ارادہ نہیں کیا تھا کہ ہم یہاں بیٹھ کر باتیں کریں اور نبی کو تکلیف ہو، بلکہ بے تکلفی میں بیٹھ گئے، اور اللہ نے اس کی تصحیح فرمائی ۔ یہاں پر ارشاد فرماتے ہیں کہ ُکوئی شخص اگر جان بوجھ کر اللہ اور اس کے رسول کو ایذا اور تکلیف پہنچاتا ہے تو اللہ نے اس پر لعنت کی ہے۔

یہاں دو باتیں بیان کی ہے: ایک اللہ کو تکلیف پہنچانا، اور دوسرے رسول کو تکلیف پہنچانا۔ یہاں ایک سوال ہوتا ہے کہ اللہ کو تکلیف پہنچانے کا کوئی مطلب ہی نہیں ہے۔ اس لیے کہ اللہ کو کسی کی کسی حرکت سے تکلیف نہیں ہوسکتی ہے۔ تکلیف تو اسے ہوتی ہے جو بدلہ لینے پر قادر نہ ہو، اللہ تو قادر مطلق ہے، اس کے یہاں تاثرات نہیں ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت رسول کو تکلیف پہنچانا، اللہ کو تکلیف پہنچانے کی طرح ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ کا ارشاد منقول ہے: وَمَنْ آذَاهُمْ فَقَدْ آذَانِي وَمَنْ آذَانِي فَقَدْ آذَى اللّٰهَ، وَمَنْ آذَى اللّٰهَ فَيُوشِكُ اَن يَّاخُذَهُ۔ [ترمذی:۳۸۶۲] جس نے صحابہ کو تکلیف پہنچائی، اس نے مجھے تکلیف پہنچائی، اور جس نے مجھے تکلیف پہنچائی اس نے اللہ کو تکلیف پہنچائی، اور جس نے اللہ کو تکلیف پہنچائی تو قریب ہے کہ وہ اسے اپنی گرفت میں لے لے۔

یہ کام مدینہ کے منافقین کرتے تھے، جو ظاہر میں ایمان رکھتے تھے، مگر حقیقت میں مومن نہیں تھے۔ وہ طرح طرح کی بات اڑا کر رسول اللہ ﷺ کو تکلیف پہنچاتے تھے، اور جس نے بھی رسول اللہ ﷺ کو تکلیف پہنچائی وہ صاحبِ ایمان نہیں ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ میں ہے کہ جب ان پر کچھ لوگوں نے تہمت لگائی تھی تو عبداللہ بن ابی بن سلول جو رئیس المنافقین تھا، یہ باتیں بنا بنا کے پھیلایا کرتا تھا۔ اس کی نیت یہ ہوتی تھی کہ حضور کو تکلیف ہو۔ اس وقت حضور ﷺ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا تھا کہ ُیہ شخص مجھے ایذا پہنچاتا ہے۔ٗ

یہ منافقین کا شیوہ تھا، اہل ایمان تو اس کی جرأت بھی نہیں کر سکتے کہ اللہ کے رسول کو کوئی تکلیف پہنچائے ،لیکن اگر کوئی تکلیف پہنچا تا ہے تو اس کو سمجھ لینا چاہیے: لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِيُ الدُّنُيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ اللہ کی پھٹکار اس پر دنیا میں بھی ہے اور آخرت میں بھی ہے۔ اور جس نے نبی کا مرتبہ نہیں پہچانا اور ایذا پہنچائی تو اس کو بہت ذلت کا عذاب ہوگا: وَاَعَدَّ لَهُمُ عَذَابًا مُهِينًا۔ اللہ نے اس کے لیے ذلت کا عذاب تیار کیا ہے، ایسا عذاب جس میں تکلیف بھی ہے اور ذلت بھی ہے۔

مومن کو ایذا پہنچانے والا سخت گنہگار ہے:

وَالَّذِينَ يُؤُذُونَ الْمُؤُمِنِينَ وَالْمُؤُمِنَاتِ بِغَيُرِ مَا اكُتَسَبُوُا فَقَدِ احُتَمَلُوُا بُهُتَانًا وَاِثُمًا مُبِينًا ۔ اس کے ساتھ ساتھ جو لوگ ایمان والے کو ایذا پہنچاتے ہیں اور مسلمان عورتوں اور مردوں پر بغیر گناہ کیے ہوئے تہمتیں لگاتے ہیں، یعنی ایسے گناہ کا الزام لگاتے ہیں جس کو انھوں نے انجام نہ دیا ہو، تو انھوں نے بہت بڑا جھوٹ اٹھایا۔ یعنی ایک تو جھوٹ کا بوجھ اور دوسرے کھلے ہوئے گناہ کا بوجھ۔

آدمی جب کسی سے بدگمان ہوتا ہے تو بے تکلف کہہ دیتا ہے کہ 'ارے فلاں تو ایسا ہے،' جس کام کو کیا نہیں ہے، اس پر اس کی تہمت لگائی جاتی ہے۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا 'مَنُ دَعَا رَجُلًا بِالْكُفُرِ ،اَوُ قَالَ: عَدُوُّ اللّٰهِ وَلَيُسَ كَذَالِكَ اِلَّا حَارَ عَلَيُهِ۔ [مسلم: ۲۱۷] اگر کسی شخص نے کسی کو کافر کہہ کر پکارا یا اللہ کا دشمن کہا، حالاں کہ وہ ایسا نہیں تو یہ [الزام] اسی [کہنے والے] کی طرف لوٹ جائے گا۔

ہمارے زمانہ میں بڑی بے احتیاطی ہے، کوئی پرواہ نہیں ہے، جس پر جو چاہتا ہے الزام رکھ دیتا ہے۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے، حالاں کہ ایمان والا شخص اگر کوئی غلطی کر دے یا اس کے کسی عیب سے کوئی واقف ہو جائے تو بھی کسی مومن کے لیے جائز نہیں ہے کہ اس کے عیب یا غلطی کی تشہیر کرے۔ ہاں اگر کوئی ایسی غلطی ہے جس کا تدارک ضروری

ہےتو قاضی یا حاکم کے پاس جا کر شکایت کرے کہ' فلاں نے ظلم کیا ہے۔' اس پر قاضی ذمہ دار ہوگا کہ اس شکایت کو دور کرے، لیکن محض لوگوں کی شکایتوں اور برائیوں کو بیان کرتے رہنا، یہ انسانیت پر بہت بڑا بدنما داغ ہے۔ کبھی نہیں کرنا چاہیے۔ جھوٹا الزام لگانے والوں کے بارے میں اللہ نے ارشاد فرمایا: فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا۔ وہ بہت جھوٹ اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھائے گا۔

منافقین کی کارستانی اور پردہ کی ضرورت:

آگے فرماتے ہیں: يَا اَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِاَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَحِيْمًا ۔ مدینہ میں منافقین کا ایک گروہ تھا، جو تماشے کیا کرتا تھا، مسلمانوں کو تکلیف پہنچایا کرتا تھا۔ اس کا مشن یہی تھا کہ کسی طرح مسلمانوں کو دباؤ۔ آپ ﷺ سے کہا جا رہا ہے' اے نبی! کہہ دو اپنی بیویوں سے، بیٹیوں سے اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہ اپنے اوپر چادر تھوڑی سی نیچی لٹکا لیں۔ باہر جب بھی نکلیں تو چادر اوڑھ کر نکلیں اور چہرے پر کچھ ڈال لیں۔ ذٰلِكَ اَدْنٰى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ۔ یہ اس سے قریب ہے کہ پہچان لی جائیں، تاکہ ان کو نہ ستایا جائے۔ دو طرح کی عورتیں تھیں: باندیاں اور خاندانی عورتیں۔ کسی با اثر گھرانے کی عورتوں کے ساتھ چھیڑ خانی سے منافقین بچتے تھے کہ پکڑ لیے جائیں گے، اور دوسرا کوئی ہوتا تو چھیڑتے۔ حکم ہوا کہ عام مسلمانوں کی عورتیں جب باہر نکلیں تو چہرہ کھلا ہوا نہیں ہونا چاہیے، چہرہ ڈھنک لیں گی تو معلوم ہوگا کہ خاندانی عورتیں ہیں، ان کو چھیڑا نہیں جائے گا۔

نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمان عورتیں آج بے پردہ باہر نکلتی ہیں، جو قرآن کی صریح خلاف ورزی ہے، اور کتنی بری نیت والے ایسے ہیں جو ایسی جگہوں پر بیٹھ کر ایسے جملے اور ایسی باتیں کرتے رہتے ہیں جو صراحتاً منافقین کا کام ہے۔ کوئی ایمان والے کو تکلیف پہنچائے، یہ نفاق کی علامت ہے۔ عورتیں بھی نکلیں تو اس طرح نکلیں کہ اپنے کو پردہ سے چھپائے رکھیں، اور دوسرے لوگ بھی اس سے پرہیز

کریں، جو ایسی حرکت کرتے ہیں۔

منافقین کا انجام:

اللہ تعالی فرماتے ہیں: لَئِنْ لَمْ يَنْتَهِ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِيْنَ فِي قُلُوْبِهِمْ مَرَضٌ وَالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ۔اگر یہ منافقین باز نہ آئیں، اور وہ لوگ جن کے دلوں میں مرض ہے، اور وہ لوگ جو مدینہ میں جھوٹی خبریں اڑاتے ہیں، افواہیں پھیلاتے ہیں۔ مدینہ میں منافقین کی ایک ایسی جماعت تھی جو مسلمانوں کو دہلانے کے لیے اور پریشان کرنے کے لیے مستقل افواہیں پھیلاتی رہتی تھی۔ اللہ تعالی فرماتے ہیں 'اگر یہ لوگ باز نہ آئیں تو ہم تم کو ان کے پیچھے لگادیں گے۔ یعنی ہم یہ حکم دے دیں گے کہ ان سب کو ختم کردو۔ اگر چہ منافقین سے آپ نے کبھی جنگ نہیں کی، حالاں کہ آپ کو معلوم تھا کہ کون کون منافق ہے، لیکن یہ ایمان ظاہر کرتے تھے، اس لیے آپ نے کبھی ان پر چڑھائی نہیں کی۔

ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَا اِلَّا قَلِيْلًا ۔ پھر یہ تمھارے ساتھ اس شہر میں نہیں رہ سکتے، مگر تھوڑے رہ سکیں گے، بقیہ نکل جائیں گے۔

مَلْعُوْنِيْنَ ۔ان پر پھٹکار رہے۔ اَيْنَمَا ثُقِفُوْا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ۔ جہاں بھی پائے گئے، پکڑے گئے مارے گئے۔ لعنت یہی ہے کہ ان کے ساتھ ایسے اسباب آجائیں گے کہ مارے جائیں گے، پکڑے جائیں گے۔ مسلمان نہیں ماریں گے بلکہ کہیں اور کسی سے پالا پڑ جائے گا۔ اللہ کی جب پھٹکار آتی ہے تو کس جگہ پکڑ آجائے کچھ نہیں کہا جاسکتا، آدمی اپنے پینترے میں خود بخود جا پھنستا ہے۔

الغرض یہ بات بڑی سنگین ہے کہ آدمی عورتوں کے ساتھ چھیڑ خانی کرے، اور عورتیں بے پردہ باہر نکلیں۔ قرآن پاک کے احکام کی صریح خلاف ورزی ہے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

❑❑❑

اللہ کے دو حکم اور دو وعدے

الحمدلله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله وصحبه اجمعين۔

اَعُوُذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيُطَانِ الرَّجِيُم

بِسُمِ اللّٰهِ الرَّحُمٰنِ الرَّحِيُمِ

يَـا اَيُّهَا الَّذِيُنَ اٰمَنُوُا اتَّقُوُا اللّٰهَ وَقُوُلُوُا قَوُلًا سَدِيُدًا ﴿۷۱﴾ يُصُلِحُ لَكُمُ اَعُـمَـالَـكُـمُ وَيَـغُفِرُ لَكُمُ ذُنُوُبَكُمُ وَمَنُ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوُلَهُ فَقَدُ فَازَ فَوُزًا عَظِيُمًا ﴿۷۱﴾ [الاحزاب]

یہ سورہ احزاب کی دو آیتیں ہیں۔سورہ احزاب قرآن کریم کی ان خصوصی سورتوں میں سے ایک ہے جن میں رسول اکرم ﷺ کے حقوق وآداب کو قدرے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔اس سورہ کا آغاز: يَـا اَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِيُنَ وَ الْـمُـنَـافِـقِيُـنَ' سے کیا گیا ہے۔یعنی اے نبی! اللہ سے ڈرو اور کافروں اور منافقوں کی موافقت مت کرو۔ پھر اس سورہ کے آخری رکوع کا بھی آغاز تقوی ہی کے حکم سے ہے۔ چنانچہ فرمایا: يَـا اَيُّهَـا الَّذِيُنَ اٰمَنُوُا اتَّقُوُا اللّٰهَ ۔اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو۔آغاز میں نبی کو تقوی کا حکم دیا گیا، جو درحقیقت نبی کے واسطے سے ایمان والوں ہی کو حکم ہے۔کیوں کہ نبی اپنی امت کا وکیل اور رہنما ہوتا ہے۔اور جو بات وکیل سے کہی گئی وہ درحقیقت اس کے موکل ہی سے کہی گئی۔تو ابتدا میں نبی کے واسطے سے امت کو یہ حکم دیا گیا اور آخر میں براہ راست امت ہی کو خطاب کیا گیا۔

تقویٰ کی اہمیت:

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کے نزدیک تقویٰ کی کتنی اہمیت اور کتنا اہتمام ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ: اِتَّقُوا اللّٰہَ فَاِنَّ التَّقْوٰی مِلَاكُ الْحَسَنَاتِ۔ اللہ سے ڈرو، کیوں کہ تقویٰ ہر نیکی کا خلاصہ اور منبع وسرچشمہ ہے۔ قرآن کریم میں اور احادیث رسول میں تقویٰ کا اتنا تاکیدی حکم ہے کہ اسے ہمہ وقت پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ تقویٰ پر دنیا و آخرت کی ہر چیز کا وعدہ ہے۔ خداوند تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا۔ وَیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ۔ [الطلاق:۲-۳] جو شخص اللہ کا تقویٰ اختیار کرتا ہے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ سہولت کی راہ نکال دیتے ہیں، اور ایسی جگہ سے روزی عطا فرماتے ہیں جہاں اس کا وہم وگمان نہیں پہنچتا۔

یہ دنیا کی بات ہوئی۔ اب آخرت کا وعدہ ملاحظہ ہو۔ حکم ہوتا ہے: وَسَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ۔ [آل عمران:۱۳۳] اور تیزی سے اپنے رب کی مغفرت اور جنت کی طرف لپکو جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے، جو کہ اہل تقویٰ کے لیے بنائی گئی ہے۔

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ دنیاوی زندگی کی سہولت اور بے وہم وگمان روزی، نیز آخرت میں حصولِ جنت کا مدار تقویٰ پر ہے۔ اس لیے تقویٰ کا جس قدر حکم قرآن وحدیث میں اہلِ ایمان کو ہے، اُتنا حکم کسی اور چیز کا نہیں ہے۔ قرآن کریم پر نظر رکھنے والا جانتا ہے کہ متعدد جگہوں پر اللہ تعالیٰ نے کسی خاص بات کا حکم دیا ہے تو اس کا آغاز تقویٰ کے حکم سے کیا ہے۔ گویا ہر نیکی سے پہلے اور ہر تعمیل ارشاد سے پہلے تقویٰ کا حکم ضرور دیا گیا۔ اس آیت میں 'قولِ سدید' درست بات بولنے کا حکم دیا گیا تو اس سے پہلے 'اتقوا اللہ' کہا گیا۔ ایک جگہ 'صادقین' کی معیت ومحبت کا حکم دیا گیا تو وہاں بھی پہلے 'اتقوا اللہ' کہا گیا۔ ارشاد ہے: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ۔ [التوبہ:۱۱۹] ایک جگہ حکم ہوا کہ دیکھ بھال کرتے رہو کہ کل قیامت کے لیے

تم نے کیا بھیجا ہے تو وہاں بھی پہلے تقوی کا حکم دیا گیا ہے۔ فرمایا: یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ۔ [الحشر:۱۵] اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ہر آدمی غور کرلے کہ کل کے لیے کیا بھیجا ہے؟

غرض یہ کہ بیشتر مقامات پر جہاں کوئی خاص حکم دیا گیا ہے وہاں ابتدا تقوی کے حکم سے کی گئی۔ اور یہ حکم ہر زمانہ اور ہر امت کو عام ہے۔ ارشاد فرمایا کہ: وَلَقَدْ وَصَّیْنَا الَّذِیْنَ اُوْتُوْا الْکِتَابَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَاِیَّاکُمْ اَنِ اتَّقُوْا اللّٰهَ۔ [النساء:۱۳۱] ہم نے تم سے پہلے اہل کتاب کو بھی اور تم [اہل قرآن] کو بھی تاکیدی حکم دیا ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہو۔ اندازہ کیجیے کہ تقوی کا حق تعالی کے نزدیک کیا مرتبہ و مقام ہے۔

تقوی کیا ہے؟:

یہاں یہ سوال قابلِ توجہ ہے کہ اللہ کے تقوی کا مطلب کیا ہے؟ تقوی کے لفظی معنی بچاؤ کے ہیں۔ یعنی آدمی کو اس کی فکر ہو کہ وہ اللہ کی ناراضگی اور غضب سے اپنا بچاؤ کرسکے۔ بچاؤ کی فکر کرنے والا ہر مضر اور نقصان دہ کام سے ڈرتا ہے۔ اور جو غلط کاموں پر سزا دینے اور حساب لینے پر قدرت رکھتا ہے، اس سے ڈرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جن کاموں پر اللہ کا غضب آسکتا ہے، اُس سے آدمی ڈرے اور بچنے کی کوشش کرے۔ اسی کا نام تقوی ہے۔ تقوی درحقیقت دل کی ایک دُھن ہے، جس کے نتیجے میں آدمی ہر اس قول و عمل اور اعتقاد و خیال سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہے جس سے اُسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔

امیر المومنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مشہور قاریِ قرآن صحابی حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ: ’ مَا التَّقْوی؟‘ تقوی کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ: ’اَمَا سَلَکْتَ طَرِیْقاً ذَا شَوْكٍ یَا اَمِیْرَ الْمُوْمِنِیْنَ !‘ اے امیر المومنین! کیا آپ کانٹوں بھرے راستے میں کبھی نہیں چلے ہیں؟ فرمایا: ’ بَلٰی ‘ کیوں نہیں، ایسی راہ پر چلنے کا بارہا اتفاق ہوا ہے۔ عرض کیا: ’فَمَاذَا فَعَلْتَ؟‘ تو آپ نے کیا کیا؟ فرمایا:

'شَمَّرْتُ وَاجْتَهَدْتُّ۔' میں نے آستین سمیٹی اور محنت وکوشش کرکے بچ بچ کے نکلا۔ انھوں نے عرض کیا کہ 'بس یہی تقویٰ ہے۔' دنیا گناہ کے کانٹوں سے بھری راہ ہے، ان کانٹوں سے بچ بچ کر نکلنا تقویٰ ہے۔

گاؤں دیہات میں یہ منظر بارہا دیکھنے میں آتا ہے کہ گھاس کرنے والی عورتیں گھاس کا گٹھر باندھ کر سر پر رکھ لیتی ہیں اور آپس میں باتیں کرتی چلی جاتی ہیں۔ دونوں ہاتھ نیچے لٹک رہے ہیں، باتیں بھی ہورہی ہیں، لیکن دھیان ہمہ وقت گٹھر پر لگا ہوا ہے۔ اگر اُس میں ذرا بھی جنبش ہوتی ہے تو ہاتھ اُسے سنبھالنے کے لیے فوراً اٹھ جاتا ہے۔ دل کی اسی فکر اور دھیان کا نام تقویٰ ہے۔ اسی لیے ایک بار رسول اللہ ﷺ نے دل کی طرف اشارہ کرکے فرمایا تھا کہ: 'اَلتَّقْوٰی هٰهُنَا۔' [مسند احمد: ۵۹] تقویٰ یہاں ہے۔ یعنی دل میں ہے۔ آدمی کے دل کی درستگی کا مدار تقویٰ پر ہے۔

قولِ سدید کا مطلب:

دوسرا حکم جو اس آیت میں دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ: 'وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا' اور بات وہ کہو جو ہر طرح سے درست اور صحیح ہو۔ قولِ سدید زبان کا وہ کلام ہے جس پر اللہ و رسول کا مواخذہ نہ ہو، شریعت کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو۔ قول سدید کی بنیاد کلمہ 'لا الٰہ الا اللہ' پر ہے۔ یہ دنیا کے کلاموں میں سب سے بڑھ کر سچا کلام ہے۔ پھر ہر سچائی قولِ سدید ہے۔ غیبت، چغلی، بدگوئی، گالی گلوج یہ سب قولِ سدید کے خلاف ہیں۔ ان دونوں حکموں پر غور کیجیے تو اس کی تعبیر اس طرح بھی ہوسکتی ہے کہ دل کو درست کرو اور زبان کو ٹھیک رکھو۔ انسان کے جسم میں یہی دو چیزیں اصل ہیں۔ انسان انھیں دونوں سے انسان بنتا ہے: ایک دل، دوسرے زبان!

وجودِ انسانی میں دل کی حیثیت:

دل کے بارے میں نبی کریم ﷺ کا مشہور ارشاد ہے: 'عَنِ النُّعْمَانِ بِنِ بَشِيْرٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: اِنَّ فِی الْاِنْسَانِ مُضْغَةً،

اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ،اَلا وَهِیَ الْقَلْبُ۔‘[مسند احمد:۵۷۲۵]انسان کے اندر گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، جب وہ درست ہوتا ہے تو پورا وجودِ انسانی درست رہتا ہے۔اور جب وہ بگڑتا ہے تو پورا وجود خراب ہو کر رہ جاتا ہے۔خوب اچھی طرح سن لو کہ وہ دل ہے۔

وجود انسانی کے اندر دل کی حیثیت بادشاہ کی ہے۔تمام اعضا پر دل کی حکم رانی ہے۔انسانی اعمال کی تمام تگ ودو دل کے اشارے اور اس کے حکم کے تابع ہے۔آنکھ اس وقت تک دیکھ نہیں سکتی، پاؤں چل نہیں سکتے، ہاتھ اٹھ نہیں سکتے، زبان بول نہیں سکتی جب تک دل کا حکم انھیں نہ ملے۔

جس طرح وجود انسانی میں دل کی اہمیت ہے،اس کے بعد اسی کے قریب زبان کی بھی اہمیت ہے۔عربی کا مشہور مقولہ ہے کہ ’اَلْاِنْسَانُ هُمَا الْاَصْغَرَانِ:اَحَدُهُمَا اَلْقَلْبُ وَآخَرُهُمَا اَلْلِسَانِ۔‘انسان دو چھوٹے عضو کا نام ہے:ایک قلب اور دوسرے زبان!

زبان کی اہمیت:

دل اگر حاکم ہے تو زبان اس کی ترجمان ہے۔انسان کے تمام تر معاملات کا تعلق اگر دل سے ہے تو بیشتر تصرفات کا تعلق زبان سے ہے۔آدمی زبان سے کلمہ توحید کا اقرار کرتا ہے،تب مسلمان ہوتا ہے۔اگر یہ نہ کرے تو وہ صاحبِ ایمان نہیں ہے۔اسلام میں سب سے اہم عبادت نماز ہے۔اس میں تکبیر،قرات،تسبیح،تشہد،درود اور سلام سب کا مدار زبان پر ہے۔یہ زبان ہی ہے جس کا کرشمہ یہ ہے کہ چند شرطوں کے ساتھ،چند لفظوں کے بول سے اجنبی عورت اپنی بیوی بن جاتی ہے۔آخر نکاح کیا ہے؟یہی تو کہ چند گواہوں کی موجودگی میں زبان سے ایجاب وقبول ہوگیا اور ایک اجنبی عورت جس کو دیکھنا،جس کو چھونا،جس سے خلوت کرنا،جس کا بے حجاب ہونا جائز نہ تھا،اب وہ بیوی بن گئی،جس کے لیے یہ سب چیزیں نہ صرف یہ کہ جائز ہوگئیں بلکہ مامور ومطلوب بن

گئیں۔اچانک یہ تبدیلی کس کی وجہ سے ہوئی ہے؟ زبان ہی وجہ سے تو! بلکہ اس سے آگے بڑھ کر دیکھیے تو پوری نسلِ آدم اور اس کی صحتِ نسب کا تعلق اسی زبان سے ہے۔اسی نکاح کی وجہ سے جس کا سارا مدار زبان کے بول پر ہے، پیدا ہونے والا بچہ نسلِ آدم میں شامل ہوتا ہے۔آج انسانوں کے تمام افراد کا نسب جو آدم علیہ السلام تک صحت کے ساتھ پہنچتا ہے ،اسی نکاح کی وجہ سے پہنچتا ہے۔یہی نہ ہوتو مرد وعورت کا جنسی تعلق حرام ہوگا، زنا کاری کا جرم ہوگا، دنیا کا بدترین گناہ ہوگا۔جو بچہ پیدا ہوگا اُس کا شمار اولادِ آدم میں نہ ہوگا۔کیوں کہ شریعت اس کے لیے کوئی باپ تسلیم نہیں کرتی۔تو جب پہلا ہی باپ غائب ہے تو اس کے آگے کیا سلسلہ ہوگا؟

بن باپ کے تو ایک ہی بزرگ حضرت عیسی علیہ السلام ہیں کہ ان کی پیدائش میں کسی مرد کا اصلاً دخل نہیں۔وہ تو بلا واسطہ محض قدرتِ الٰہی سے شکمِ مادر میں آئے۔روح من اللہ ہیں، جیسے آدم علیہ السلام جو کہ بغیر کسی مرد وعورت کے واسطہ کے محض قدرتِ الٰہی سے پیدا ہوئے اور تمام انسانوں کے جدِ امجد ہوئے۔حق تعالی کا ارشاد ہے: اِنَّ مَثَلَ عِیۡسٰی عِنۡدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَہٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ۔[آل عمران:۵۹] عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم جیسی ہے، اللہ نے ان کو مٹی سے پیدا کیا، پھر فرمایا ہو جاؤ، پس زندہ ہو گئے۔اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام محض قدرتِ الٰہی سے ماں کے شکم میں وجود میں آئے۔

اِن کے علاوہ جو کوئی بغیر رشتہ نکاح کے، بغیر ایجاب وقبول کے وجود میں آئے گا، وہ شکل وصورت کے اعتبار سے خواہ کچھ ہو، اولادِ آدم میں نہ ہوگا۔حدیث میں ہے: اَلۡوَلَدُ لِلۡفِرَاشِ وَلِلۡعَاهِرِ اَلۡحَجرُ۔[بخاری:۲۲۱۸] بچہ اس کا ہے جس کے تحت عورت شریعت کے حکم کے مطابق ہو، اور زانی کے لیے صرف سنگ سار ہونا ہے۔

معلوم ہوا کہ پوری نسلِ انسانی کے صحتِ نسب کا مدار اسی زبان پر ہے۔اور زبان ہی سے نکلا ہوا بول ہوتا ہے جس سے رشتہ نکاح منقطع ہو جاتا ہے۔آخر لفظِ ’طلاق‘

کا تلفظ جب تک زبان سے نہ ہو، بیوی ہونے کا رشتہ منقطع نہیں ہوتا، خواہ میں دل میں کتنا ہی سوچے، عزم کرے، پختہ نیت کرلے۔ ہاں جب زبان سے بیوی کے حق میں یہ لفظ نکل جائے گا تو خواہ بغیر ارادے کے نکلا ہو، خواہ ہنسی مذاق میں نکلا ہو، خواہ نادانستگی میں نکلا ہو، بیوی اس کے بعد بیوی نہیں رہتی۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ انسان کی زندگی میں زبان کا کتنا دخل ہے۔ اگر اس کی پوری تفصیل بیان کی جائے تو دفتر درکار ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ باہمی معاملات میں تمام دارومدار زبان ہی پر ہے۔ ایک آدمی ملازمت کی درخواست دیتا ہے، یہ بھی زبان کا عمل ہے۔ دوسرا آدمی اُسے منظور کرتا ہے، یہ بھی زبان ہی کا عمل ہے۔ اسی پر دنیا کے تمام معاملات دیکھ لیجیے۔ ہر جگہ زبان کی کارفرمائی ہے، اور تمام دنیا اسی پر چلتی ہے۔

حق تعالی نے اس آیت میں ایمان والوں کو ہدایت دی ہے کہ تم دل کو تقوی کے ذریعے اور زبان کو قولِ سدید یعنی درست بات کے ذریعے صحت منداور راہ راست پر رکھو۔ اگر تم نے ان دونوں کی درستگی اور صحت کا اہتمام کرلیا تو گویا انسانیت سُدھر گئی اور انسانی معاشرہ سُدھر گیا۔

زبان و دل کی درستگی پر اللہ کے دو وعدے:

ان دونوں کے سُدھار پر اللہ تعالی نے دو باتوں کا وعدہ فرمایا ہے، اور غور کریں تو یہ دونوں باتیں پوری انسانیت کی صلاح وفلاح کی کنجی ہیں: ایک وعدہ تو یہ ہے کہ: یُصۡلِحۡ لَکُمۡ اَعۡمَالَکُمۡ۔ تمھارے کاموں کو درست کردیں گے، انھیں ٹھیک کردیں گے۔ اس وعدے کا تعلق دنیا سے ہے۔

کاموں کا بن جانا دو طرح سے ہوتا ہے: ایک یہ کہ حق تعالی کی جناب سے صحیح کاموں کی توفیق ملے۔ مزاج وطبیعت کا رجحان ہی ایسا بن جائے کہ وہ درست اور نیک عمل ہی کو اختیار کرے۔ غلط کاموں سے اسے فطرتاً رکاوٹ ہو جائے۔ یہ تقوی اور قولِ سدید کی برکت سے ہوگا۔ متقی قلب گناہ کے کاموں سے متنفر اور بے زار ہوتا ہے، اور

زبان کی صحت اسے غلط باتوں اور غلط باتوں کے لازمی نتائج سے محفوظ رکھتی ہے۔اور اگر زبان درست نہ ہوتو ایک غلطی سے متعدد غلطیاں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں اور کام خراب ہوتا چلا جاتا ہے۔مثلاً ایک آدمی جھوٹ بولتا ہے تو اسے نباہنے کے لیے متعدد جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔آدمی ایک گالی دیتا ہےتو نہ جانے کتنے خون خرابے میں پڑتا ہے۔ ایک غیبت کرتا ہےتو سیکڑوں دشمنیاں اس کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں۔اور اگر آدمی سچ بولے،زبان کو شیریں اور بےضرر رکھے،تو امن و عافیت کی چادر تنی رہتی ہے۔یُصۡلِحۡ لَکُمۡ اَعۡمَالَکُمۡ کا ایک مصداق یہ ہے کہ نیک اور صحیح کاموں کی توفیق ملتی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کبھی بظاہر کام بگڑا ہوا معلوم ہوتا ہے اور خطرناک صورتِ حال کے پیش آنے کا اندیشہ ہوتا ہے،لیکن حق تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے تقوی اور قولِ سدید کی برکت سے اس خطرے کو فنا کر دیتے ہیں اور وہی کام درست ہو جاتا ہے۔

قولِ سدید اور صلحِ حدیبیہ:

صلحِ حدیبیہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے جن دفعات پر صلح کی تھی، ان میں سے ایک دفعہ یہ تھی کہ ’کافروں یا مسلمانوں میں سے کوئی شخص اگر مدینہ جائے تو واپس کر دیا جائے،لیکن اگر کوئی مسلمان مکہ جائے تو واپس نہیں کیا جائے گا‘

اس صلح نامے کی بیشتر دفعات مسلمانوں کے جذبات کے خلاف تھیں اور ان میں سے خاص طور سے مذکورہ دفعہ سب سے مشکل تھی۔چنانچہ اس کا مشکل ہونا عین اُسی وقت ظاہر ہو گیا،جب کہ ابھی صلح مکمل بھی نہ ہوئی تھی۔

اتفاق دیکھیے ! یا حق تعالیٰ کو پیغمبر اسلام علیہ الصلاۃ والسلام کی استقامت و صداقت کا اور اصلاحِ عمل کا اظہار مقصود تھا،عین صلح لکھے جاتے وقت کافروں کے بااختیار سفیر و قاصد سہیل بن عمرو جو صلح کی گفتگو کے لیے آیا تھا،اس کی موجودگی میں ہی اس کے بیٹے حضرت ابوجندل جو اسلام لا چکے تھے،اور مکہ میں کافروں نے ان کو قید کر رکھا

تھا، اور انھیں اس قدر مارا تھا کہ ان کے جسم پر زخموں کے نشان تھے، کسی طرح بھاگ کر پاؤں میں بیڑیاں پہنے ہوئے آئے اور سب کے سامنے گر پڑے۔ سہیل نے کہا 'یہ صلح کی تعمیل کا پہلا موقع ہے۔ اس کو [ابوجندل] شرائطِ صلح کے مطابق مجھے واپس دیدو۔' آں حضرت ﷺ نے فرمایا 'ابھی معاہدہ پورا قلم بند نہیں ہوا ہے۔' سہیل نے کہا کہ 'تو ہم کو صلح بھی منظور نہیں۔' آپ نے چند بار فرمایا کہ 'ابوجندل کو یہیں چھوڑ دو' مگر سہیل کسی طرح راضی نہیں ہوا۔ مجبوراً آپ نے منظور فرمالیا۔

حضرت ابوجندل رونے لگے، انھوں نے اپنے جسم کے زخم دکھائے اور مسلمانوں سے کہا کہ 'کیا آپ لوگ مجھے اِسی حالت میں رکھنا چاہتے ہیں؟ میں مسلمان ہو چکا ہوں، کیا مجھے پھر کافروں کے ہاتھ میں دیتے ہیں؟' تمام مسلمان تڑپ گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ضبط نہ ہوسکا، وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا 'یا رسول اللہ! کیا آپ پیغمبر برحق نہیں ہیں؟' آپ نے ارشاد فرمایا 'ہاں، ہوں۔' عرض کیا کہ 'کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟' فرمایا 'ہاں ہم حق پر ہیں۔' عرض کیا 'تو ہم دین میں یہ ذلت کیوں گوارا کریں؟' فرمایا 'میں خدا کا پیغمبر ہوں، اور خدا کے حکم کی نافرمانی نہیں کرسکتا۔ خدا میری مدد کرے گا۔' [مسند احمد:۱۰۷۹۰]

بظاہر یہ صورتِ حال اور یہ دفعہ مسلمانوں کے حق میں سخت تکلیف دہ تھی، مسلمانوں کو بڑا صدمہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوجندل سے فرمایا: اِصْبِرُ وَ احْتَسِبْ فَاِنَّ اللّٰهَ جَاعِلٌ لَكَ وَلِمَنْ مَعَكَ مِنِ الْمُسْتَضْعِفِيْنَ فَرَجاً ومخرجاً اِنَّا قَدْ عَقَدْ نَا بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ صُلْحاً وَاِنَّا لَا نَغْدِ رُ بِهِمْ۔ [مسند احمد:۱۰۷۹۰] صبر کرو اور ضبط سے کام لو، خدا تمھارے لیے اور مظلوموں کے لیے کوئی راہ نکالے گا۔ صلح ہو چکی ہے اور ہم بدعہدی نہیں کر سکتے۔

بظاہر کام بگڑا ہوا ہے، مسلمانوں کے صبر وضبط کا شدید امتحان ہے، مگر جو زبان دی جاچکی ہے، اور عہد کیا جاچکا ہے، اس کو برقرار رکھنا تقوی کا بھی تقاضا ہے اور قولِ

سدید کی بھی پاس داری ہے۔اور رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر دل کا متقی اور زبان کا سچا اور پکا کون ہوسکتا ہے۔حالات خلاف جارہے ہوں تو جائیں، مگر عہد کی پختگی ضروری ہے۔ لیکن حق تعالی کی مہربانی دیکھیے کہ یہی دفعہ جو سب سے زیادہ صبر آزما تھی، اللہ نے حالات کو اس طرح بدلا کہ یہی دفعہ کفار کے حق میں خطرناک بن گئی اور مسلمانوں کے لیے سرتا سرکار آمد ہوگئی، اور بالآخر کفار نے ہی اس کو ختم کرنے کی درخواست کی۔

ہوا کہ حضرت ابوجندل سمیت جو مسلمان مکہ میں مجبوری سے رہ گئے تھے، چوں کہ کفار انھیں سخت تکلفیں دیتے تھے، اس لیے وہ بھاگ کر مدینہ آنا چاہتے تھے، مگر مذکورہ دفعہ کی وجہ سے وہ مدینہ آنے سے مجبور ہوجاتے تھے۔ابتداءً ہی جب کہ مسلمان مدینہ واپس آچکے تھے، ایک صحابی حضرت عتبہ بن اسید رضی اللہ عنہ جن کی کنیت ابوبصیر تھی، بھاگ کر مدینہ آئے۔قریش نے آں حضرت ﷺ کے پاس دو آدمی بھیجے کہ 'ہمارا آدمی واپس کردیجیے۔' آپ نے ابوبصیر سے فرمایا کہ 'واپس جاؤ۔' انھوں نے عرض کیا 'کیا آپ کافروں کے پاس مجھے بھیجتے ہیں کہ وہ مجھے کفر پر مجبور کریں۔' آپ نے فرمایا کہ 'جاؤ خدا کوئی تدبیر نکالے گا۔' حضرت ابوبصیر مجبوراً کافروں کی حراست میں واپس چلے۔مقام ذوالحلیفہ میں پہنچ کر انھوں نے سوچا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنا عہد تو پورا کردیا، میں آپ کی پناہ سے نکل کر کافروں کے قبضے میں آچکا ہوں، لیکن کیا ضروری ہے کہ میں ان کے ساتھ واپس چلا جاؤں۔انھوں نے موقع پاکر ایک کو قتل کردیا۔دوسرا شخص جو بچ گیا تھا، بھاگ نکلا۔حضرت ابوبصیر وہاں سے بجائے مدینے آنے کے مقام عیص میں جو سمندر کے کنارے ہے، اقامت اختیار کرلی اور مکہ کے بے کس اور ستم رسیدہ لوگوں کو پیغام بھیجا کہ 'وہ مدینہ نہ جائیں، یہاں آجائیں۔' وہ لوگ آہستہ آہستہ بھاگ کر کافی تعداد میں اس جگہ جمع ہوگئے، اوران لوگوں نے اتنی قوت حاصل کرلی کہ قریش کا کاروانِ تجارت جو شام کو جاتا، اسے روک لیتے۔ان حملوں میں جو مال غنیمت مل جاتا وہ معاش کا سہارا بنتا۔

قریش پریشان ہوگئے اور انھوں نے مجبور ہوکر رسول اللہ ﷺ کو لکھ بھیجا کہ

'معاہدہ کی اس شرط سے ہم باز آئے۔اب جو مسلمان چاہے مدینہ میں جا کرآباد ہوسکتا ہے، ہم اس سے تعرض نہ کریں گے۔' آپ نے ان مسلمانوں کو لکھ بھیجا کہ 'یہاں چلے آؤ'۔ جس وقت آپ کا مکتوبِ گرامی پہنچا، حضرت ابوبصیر کا آخری وقت تھا۔انھوں نے نامہ مبارک کو بوسہ دیا اور باقی لوگوں سے کہا کہ 'واپس مدینہ چلے جائیں'۔ان کا وہیں انتقال ہوگیا۔اور مسلمانوں کی عارضی آبادی مدینہ شریف منتقل ہوگئی، اور کفار نے چین کی سانس لی۔[مسند احمد:۱۰۷۸۹]

یہ نمونہ ہے کہ بظاہر ایک بگڑا ہوا معاملہ تھا، لیکن حق تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے حالات کو ایسا بنادیا کہ وہی عین موافق ہوگیا۔تقوی اور قولِ سدید کا یہ ثمرہ ہے۔

یہ ثمرہ تو دنیا کا ہے۔اورآخرت کا ثمرہ بیان فرمایا کہ:وَيَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوبَكُمْ۔ تمھارے گناہوں کی مغفرت فرمائیں گے، تمھیں نارِ جہنم سے بچائیں گے اور ہمیشہ کی نعمتوں میں قرار عطا فرمائیں گے۔گناہوں کی وجہ سے آدمی آخرت میں تو برباد ہوتا ہی ہے، دنیا میں بھی طرح طرح کی بلائیں اس پر برس پڑتی ہیں۔جب مغفرت کا پروانہ عطا ہوگا تو آخرت کی نجات کے ساتھ دنیا کے مصائب سے بھی اُسے نجات مل جائے گی۔ آدمی کو اور کیا چاہیے؟ دنیا سدھر جائے، آخرت سنور جائے۔دنیا کی زندگی راحت وچین کی ہو، اس کو اچھے کاموں کی توفیق ملتی رہے، بگڑے کام بنتے رہیں اور مرنے کے بعد جہنم سے بچا لیا جائے اور جنت میں داخلہ مل جائے۔اس کے علاوہ اور کیا چاہیے؟ یہی تو کامیابی ہے: فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ۔ [آل عمران:۱۸۵] جو شخص جہنم سے بچالیا گیا اور جنت میں پہنچا دیا گیا، حقیقتاً کامیاب و بامراد وہی ہے۔

اصولی بات:

آخر میں ایک اصولی بات فرمائی جو تقوی اور قولِ سدید اور دوسری تمام نیکیوں کی بنیاد ہے۔فرمایا:وَمَن يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزاً عَظِيْماً۔ جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرتا ہے، اس نے بڑی کامیابی حاصل کرلی۔

خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے دو باتوں کا حکم دیا ہے اور دو باتوں کا وعدہ فرمایا ہے، اور پھر ایک بہت ہی جامع بات ارشاد فرمائی۔ حکم یہ ہے:

۱- تقوی اختیار کرو۔

۲- درست بات بولا کرو۔

دوسرے لفظوں میں دل کو ٹھیک رکھو اور زبان کو سدھارو۔ ان دونوں حکموں کی تعمیل پر دو باتوں کا وعدہ ہے:

۱- اصلاحِ اعمال۔ یعنی نیک کاموں کی توفیق ہوگی، بگڑے ہوئے کام بنائے جائیں گے۔

۲- گناہوں کی مغفرت ہوگی۔

جامع بات یہ ہے کہ:

''بڑی کامیابی کی بنیاد اللہ اور رسول کی فرماں برداری میں ہے۔''

اللہ تعالیٰ توفیق دیں۔ آمین

❑❑❑

جزا وسزا کا تعلق اختیار سے ہے، تسخیر سے نہیں

الحمدلله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله وصحبه اجمعين۔

اَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهُ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ﴿۷۲﴾ لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنَافِقِيْنَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكَاتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَحِيْمًا ﴿۷۳﴾

یہ سورہ احزاب کی آخری دو آیتیں ہیں، ان دو آیتوں میں اللہ تعالی نے کائنات میں انسان کی جو واقعی حیثیت ہے اور جو اس کی ذمہ داری ہے، اس کو نہایت جامع انداز میں بیان فرمایا ہے۔ اگر یہ بات انسان ہمیشہ یاد رکھے تو اس کا راستہ ہمیشہ صحیح رہے گا کبھی بھٹکے گا نہیں۔ پوری سورت میں آپ نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ کیا چیز لائے ہیں، اور کیسا معاملہ امت کو ان کے ساتھ کرنا ہے؟ یہاں اللہ نے انسان کی اصل حیثیت کو چند لفظوں میں واضح فرمایا ہے اور یہ بہت یاد رکھنے کی بات ہے۔

اللہ فرماتے ہیں: اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ۔ ہم نے ایک امانت رکھی آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے۔ یہ کائنات کی بڑی بڑی مخلوق ہیں۔ آسمان اپنے ڈیل ڈول کے اعتبار سے سب سے بڑی

مخلوق ہے، زمین بھی بڑی مخلوق ہے، اور زمین کے اوپر پہاڑ پیدا فرمایا ہے، یہ بھی بڑی طاقت ور مخلوق ہے۔ان کے سامنے امانت رکھی کہ اسے قبول کرو، اس کی ذمہ داری کو سنبھالو۔ فَاَبَیۡنَ اَنۡ یَحۡمِلۡنَهَا۔ سب نے انکار کر دیا کہ ہم سے یہ ذمہ داری نہیں سنبھلے گی ۔یہ جو انکار ہے، اس لیے نہیں ہے کہ انھوں نے سرکشی کی اور اللہ کے حکم سے سرتابی کی ،اللہ کا حکم نہیں مانا، بلکہ اللہ فرماتے ہیں: وَاَشۡفَقۡنَ مِنۡهَا۔ اس کی ذمہ داریوں سے ڈر گئے ،انھیں خوف ہوا کہ وہ اس کی ذمہ داریوں کو ادا نہیں کر سکیں گے۔

مقام ومرتبہ ذمہ داری ادا کرنے سے ملتا ہے:

آپ اندازہ کیجیے کہ ایسی بڑی بڑی مخلوقات جس ذمہ داری کے ادا کرنے سے ڈر جائیں اور اس کو نہ قبول کریں، وہ ذمہ داری کتنی بڑی ہوگی اور کتنی اہم ہوگی! اور یہ بھی معلوم ہے ذمہ داری جتنی اہم ہوتی ہے، اس میں کوتاہی کرنے سے اتنی ہی سخت پکڑ ہوتی ہے، اور اگر کوئی شخص اہتمام سے اس کو نبھائے ،ارادہ اور قصد کرے، کبھی اس میں خیانت کا بھی نہ سوچے تو اس کے نباہ دینے کے بعد جو انعام ملتا ہے، جو دولت ملتی ہے، جو مرتبہ ملتا ہے، وہ بھی بہت بڑا ہوتا ہے۔ جتنی بڑی ذمہ داری ہوتی ہے، اس کے نباہ دینے پر اتنا ہی بڑا مقام ملتا ہے۔ کوئی چھوٹا کام کسی نے کر دیا تو اسے چھوٹا سا انعام مل جائے گا، لیکن اگر کسی کا بڑا کام کر دیا، تو پھر اس انعام کی کوئی غایت اور انتہا نہیں رہتی۔ اللہ نے یہ بات واضح رکھی کہ بڑی ذمہ داری ہے، مگر زمین، آسمان، پہاڑ ڈر گئے، اور کہنے لگے ہم جس حیثیت میں ہیں، اسی میں رہنا ہمیں منظور ہے، ہم سے نبھے گی نہیں۔ اس لیے ہمیں اِسی حال میں رہنے دیجیے۔ چنانچہ زمین کو اللہ نے اسی حال میں رہنے دیا، مخلوق چلتی ہے، کھودتی ہے، مکان بناتی ہے، لیکن اللہ کا اس پر تکوینی حکم صادر ہے، تم جیسی ہو پڑی رہو، تمھیں کھود دیا جائے تم اُف تک نہ کہو، مکان بنے تو تمھیں کوئی پریشانی نہ ہو، تمھیں جوت کر بیج ڈالا جائے تو تمھارا کام ہے اسے باہر نکال دو۔ یہ ذمہ داریاں ہیں، تم اس کو ادا کرو۔ باقی جزا اور سزا کی کوئی ذمہ داری، اختیاری اعمال کی کوئی ذمہ داری تمھارے لیے نہیں ہے۔ اسی لیے زمین کا کوئی مرتبہ نہیں ہے۔ کل قیامت میں جنت میں

یا جہنم میں زمین کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ آسمان اور پہاڑ کا بھی یہی حال ہوگا، آسمان کل قیامت میں ٹوٹ پھوٹ جائے گا، پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائے گا، ان کا آخری انجام یہ ہے کہ ختم کر دیے جائیں گے۔ جزا و سزا اور انعام و اکرام کا کوئی معاملہ ان کے ساتھ نہ ہوگا، جو جس مقام پر ہے، اسی مقام پر رہے گا۔ پھر آسمان کی مخلوق، وہ بھی اسی حال میں ہیں۔ اللہ فرماتے ہیں، فرشتے کہتے ہیں: وَمَامِنَّا اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ۔ [الصافات:۱۶۴] اور [فرشتے تو یہ کہتے ہیں کہ] ہم میں سے ہر ایک کا ایک معین مقام ہے۔ یعنی ایک مرتبہ اور مقام سارے فرشتوں کا ہے، نہ اس سے آگے بڑھیں گے، اور نہ اس سے پیچھے ہٹیں گے۔

اللہ نے انسان کو ظلوم وجہول از راہِ محبت کہا ہے:

وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ۔ اور یہ امانت انسان پر پیش کی تو اس نے قبول کر لیا، اس نے کہا ٹھیک ہے ہم اٹھائیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔ انسان بڑا ظالم، بڑا جاہل ہے۔ اللہ ہی ظالم اور جاہل کہہ دیں تو کون اسے عالم کہہ سکتا ہے کون اسے عادل کہہ سکتا ہے، مگر شاید اللہ نے یہ پیار میں کہا ہے۔ کوئی نہیں سن رہا تھا، کوئی نہیں اٹھا رہا تھا، مگر اس ناتواں کمزور نے اٹھا لیا۔ آپ اپنے بیٹوں سے کہیں کہ 'یہ کام کر دو، کوئی نہ تیار ہو، مگر جو سب سے کمزور ہو، وہ کہے کہ 'لائیے ہم کر دیں۔' تو آپ کہیں گے 'تم سے اٹھے گا؟ تم کر لو گے؟ بڑے پاگل ہو، یہ تم سے ہوگا؟' یہ جو پاگل کہا ہے یہ بطور غصہ اور غضب کے نہیں کہا ہے، بلکہ محبت میں اور پیار میں کہا ہے۔ یہاں اللہ نے انسان کو جو ظالم اور جاہل کہا ہے، اس میں اللہ کی محبت اور اس کا پیار دکھائی دے رہا ہے۔ کوئی نہیں اٹھا رہا، اس انسان نے اٹھا لیا، تو اللہ نے کہا 'بڑا ظالم، بڑا جاہل ہے۔'

ظلم کہتے ہیں بے موقع کام کرنے کو اور جہل کہتے ہیں بے جانے بوجھے کام کرنے کو۔ کچھ سوچا نہ سمجھا بس اٹھا لیا۔

وہ امانت کیا ہے جسے انسان نے اپنے ذمہ لیا:

اب یہاں یہ سوال ہے کہ 'وہ امانت کیا ہے؟' کس چیز کو اللہ نے ساری مخلوقات

کے سامنے رکھا اور سب نے انکار کردیا۔ یہ ذمہ داری ہے ایمان اور اعمال صالحہ کی استعداداور صلاحیت کی، جس کو فطرت کہا گیا ہے۔ایک صلاحیت انسان کے اندر رکھی گئی ہے،اسی استعداداور صلاحیت کواختیار کے ساتھ مصائب میں،تکالیف میں اور آزمائشوں میں گھیر کراس سے کہہ دیا گیا ہے'اب یہ کرنا ہے یہ نہیں کرنا ہے۔' یہی کرنے اور نہ کرنے کی جواستعداد ہے،اسی کا نام'امانت' ہے۔مفسرین نے اس کی الگ الگ تفسیر کی ہے۔ کسی نے کہا'دین امانت ہے۔' کسی نے کہا'قرآن امانت ہے۔' کسی نے کہا'ایمان امانت ہے۔' یہ سب صحیح ہے۔ مجموعی اعتبار سے ان سب کی صلاحیت اصل میں امانت ہے۔اختیار مل گیا ہے، چاہےتو کرے چاہےتو نہ کرے۔

جزاوسزا کاتعلق اختیار سے ہے تسخیر سے نہیں:

اللہ نے کائنات کی ہر شے کو کارآمد بنایا،سب کا کام موجود ہے،لیکن ان میں سے کسی کو یہ اختیار نہیں ہے کہ چاہےتو کریں چاہےتو نہ کریں،جس کوجس کام پر لگادیا گیا ہے، وہ اس کو کرنا ہے۔اس کو تسخیر کہا گیا ہے، مسخر کردیا گیا ہے۔آسمان، زمین، چاند سورج سب مسخر ہیں،ان کو حکم ہے کہ چلو،تو چلتے رہتے ہیں،ایک رفتار متعین ہے،اسی پر وہ چلتے رہتے ہیں۔دریا کو حکم ہے کہ بہتے رہوتو وہ بہتا رہتا ہے، فائدہ پہنچاتے رہوتو وہ فائدہ دیتا رہتا ہے،ان میں سرتابی کی مجال نہیں ہے۔ جو حکم ملا وہ کررہے ہیں۔ یہ عمل اختیاری نہیں غیراختیاری ہے، یہ تکوینی ہے۔اس طرح کا حکم خودانسانوں پر بھی ہے،لیکن اس طرح کے احکام پر کوئی جزاوسزا نہیں ہے۔مثلاً حکم ہوا کہ پیدا ہو جاؤ تو پیدا ہو جاتا ہے۔ بچہ ہے،اللہ کی طرف سے حکم ہے کہ تدریجا بڑھتے رہوتو وہ تدریجا بڑھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جوانی کو پہنچ جاتا ہے،اعضا مضبوط ہو جاتے ہیں، پھر آدمی چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ بڑھاپے کو پہنچ جاتا ہے۔ پھر حکم ہوتا ہے کہ بیمار ہو جاؤ تو بیمار ہو جاتا ہے۔ گورے رہوتو گورا ہے، کالے رہوتو کالا ہے۔ الغرض یہ وہ احکام ہیں جن میں انسان کو بالکل اختیار نہیں ہے۔اس لیے اِن پر کوئی سزا نہیں ہے، نہ کسی کالے کوسزا ہے نہ کسی گورے کوسزا

ہے۔ان کا کوئی تعلق امانت سے نہیں ہے۔امانت وہ ہے کہ آدمی کو اختیار ہو، اور اللہ کی طرف سے حکم ہو کہ یہ کام کرو، تو وہ اپنے اختیار سے کرے، یا نہ کرے، حکم ہو کہ یہ کام مت کرو اور وہ اپنے اختیار سے کرنے لگے۔ نافرمانی اور فرماں برداری اپنے اختیار سے کرے۔ یہ تشریع ہے، یہی امانت ہے۔

کائنات میں خیر وشر دونوں طرح کے نمونے اللہ نے رکھے ہیں:

اللہ نے حکم بھیجا کہ 'ایمان لاؤ، توحید پر آؤ' لیکن اختیار نے انسان کو اتنا بگاڑا کہ ایمان نہیں لایا، کہا 'مر کر دوبارہ پیدا ہوگے' تو کہا 'کیسے مر کر دوبارہ پیدا ہوں گے۔' کہا 'آخرت آنے والی ہے، جنت جہنم ہے۔' تو کہا 'کہاں جنت جہنم ہے؟' ہم اسی دنیا میں کھائیں گے، عیش کریں گے، مستی کریں گے۔ یہ سب اسی اختیار کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ استعداد دونوں کی ہے اور اللہ نے دونوں کو سامنے رکھ کر نمونے ظاہر فرمائیں ہیں: ایک وہ آدمی ہے جس کے سامنے دنیا کا بڑے سے بڑا نفع آرہا ہے، لیکن وہ دیکھتا ہے کہ پروردگار نے منع فرمایا ہے تو وہ رک جاتا ہے، ذرا بھی رغبت نہیں کرتا ہے۔ ایک آدمی وہ ہے جسے حکم ہے روزہ رکھو، شدید پیاس لگی ہے، پانی بھی موجود ہے، کوئی دیکھ نہیں رہا ہے، لیکن پھر بھی وہ پانی پینے کا ارادہ نہیں کرتا۔ یہ انسان اپنے اختیار سے اللہ کی فرماں برداری کرتا ہے۔ اور ایک آدمی وہ ہے جو کہے کہ 'میں کیسے روزہ رکھوں گا؟ لاؤ کھا لیتا ہوں' اور وہ کھا لیتا ہے، وہ اپنے اختیار سے ہی نافرمانی کرتا ہے۔ کائنات میں دونوں طرح کے نمونے موجود ہیں۔ ماحول ایسا بنا دیا گیا ہے کہ اسی میں کوئی طغیان کی طرف جاتا ہے اور کوئی نفس کو مار کر اللہ کی اطاعت اور فرماں برداری میں لگ جاتا ہے، تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ سب انسانوں کی فطرت ہی غلط ہے، اور یہ بھی نہ کہہ سکے کہ سب کے سب پاکباز ہیں۔

فرشتے اور شیاطین کا اختیار ادھورا ہے:

سب کے سب نیک ہو جاتے تو یہ ہوتا کہ شاید ان میں برائی کا مادہ ہی نہیں ہے،

جیسے فرشتے اللہ کی مخلوق ہیں، وہ بھی صاحبِ اختیار ہیں، لیکن ان کا اختیار صرف نیکیوں میں ہے، صرف اطاعت میں ہے، برائی کا کوئی اختیار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی فرشتہ برائی کی طرف جاتا ہی نہیں۔ اور ایک مخلوق ہے شیطان، وہ بھی صاحبِ اختیار ہے، اپنے اختیار ہی سے کام کرتا ہے، مگر اس کا اختیار صرف برائی کرنے میں ہے۔ ہر برائی کا ارتکاب کر لیتا ہے، بھلائی میں اس کا کوئی اختیار نہیں، بھلائی کی طرف اس کی سوچ بھی کبھی نہیں جاتی۔ اختیار شیطان کو ملا، لیکن ادھورا، اختیار فرشتوں کو ملا، لیکن ادھورا، یہ درمیانی مخلوق انسان ہے، جسے دونوں طرف کا اختیار ہے، بھلائی کا بھی اختیار ہے، برائی کا بھی اختیار ہے، اور اسی اختیار کو اللہ نے امانت قرار دیا ہے۔

تمثیل برائے تفہیم:

بہت مشہور بات ہے، میں اس کی صحت کی ضمانت تو نہیں دیتا لیکن کتابوں میں لکھا ہے کہ ’ہاروت ماروت فرشتے تھے، فرشتوں نے انسانوں پر اعتراض کیا کہ انسانوں کا حال دیکھیے، اللہ نے پیدا کیا، اس پر اللہ کا اتنا احسان ہے مگر کمال ہے نافرمانی کرتا ہے، محسن کی شکر گذاری نہیں کرتا۔‘ تو اللہ نے فرمایا جس ماحول میں وہ ہیں اور جو مادہ ان کے اندر ڈالا گیا ہے، اگر وہ ماحول اور مادہ تمھارے اندر بھی ڈال دیا جائے تو تم بھی وہی کام کروگے۔ تمھارے اندر برائی کا مادہ ہے ہی نہیں، اس لیے تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ برائی بھی کی جا سکتی ہے۔ اور جب برائی کا مادہ ان کے اندر بھی ڈال دیا گیا تو کون سی نافرمانی تھی جو ان سے نہیں ہوئی۔

آپ اتنی بڑی مثال پر مت جایئے اور قریب آیئے۔ دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں: کچھ انتظام کے ذمہ دار ہوتے ہیں، مثلاً بادشاہ، ناظم، سکریٹری، صدر وغیرہ۔ اور کچھ ان کے ماتحت ہوتے ہیں۔ ہر زمانہ میں بادشاہ اور رعایا میں، صدر، ناظم اور سکریٹری اور ماتحتوں میں چپقلش چلتی رہتی ہے، فریق بنتے رہتے ہیں۔ جو ماتحت ہیں، یہ اپنے اوپر والے پر الزام دھرتے ہیں کہ یہ غلط کر دیا، یہ صحیح نہیں ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اُنھیں

غلط کہنے والوں کو وہ ذمہ داری دے دی جاتی ہے کہ 'لیجیے! اب آپ ہی کیجیے'، لیکن وہ بھی وہی کام کرنے لگتے ہیں۔ ان سے کہا جائے کہ اب کیوں کر رہے ہو، تو کہیں گے کہ 'مجبوری ہے۔' ایک ماحول ہوتا ہے، اس میں اپنے آپ کو سنبھال لینا اور صحیح طور پر لے جانا اور اعتراض سے بچ جانا، یہ بہت مشکل کام ہے۔

فرشتوں کو نافرمانی کا اختیار ملا ہی نہیں ہے:

تو ایسے ہی فرشتے ہیں: لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ۔ [التحریم:٦] وہ اللہ کی نافرمانی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ فرشتوں کا پورا گروہ تسبیح و تقدیس میں لگا ہوا ہے۔ ان کا ایک مقام ہے، اس پر پڑے ہوئے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ 'جو سجدہ کیے ہوئے ہیں وہ سجدہ میں پڑے ہیں، جو رکوع کیے ہوئے ہیں وہ اسی میں ہیں، جو قیام کیے ہیں وہ اسی حالت میں ہیں، اسرافیل علیہ السلام صور لیے کھڑے ہیں، جب حکم ہوگا پھونک دیں گے، ان کی مستقل عبادت یہی ہے، عزرائیل علیہ السلام کو حکم ہے چلتے رہو، کائنات میں دیکھتے رہو، جس جس کی روح نکالنی ہے نکالتے رہو، وہ یہی کام کر رہے ہیں۔ ہر ایک اپنے کام میں لگا ہوا ہے، اس کے علاوہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔

شیطان کو طاعت اور انسان کی ہمدردی کا اختیار نہیں ملا ہے:

شیاطین کو حکم ہوا ہے لوگوں کو بگاڑتے رہو، بہکاتے رہو، وہ اسی میں لگا ہے۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ کسی انسان کی میں ہمدردی کر دوں۔ مولانا روم نے مثنوی میں واقعہ لکھا ہے کہ 'حضرت امیر معاویہ اپنی خواب گاہ میں لیٹے ہوئے تھے تو اتفاق سے ان کی تہجد چھوٹ گئی۔ صبح کو بہت روئے بہت روئے۔ ہمیشہ کا معمول تھا، بہت تکلیف ہوئی۔ دوسرے دن جب سوئے تو کوئی پیر دبا رہا ہے کہ 'اٹھیے! حضرت! جلدی کریئے۔' انھوں نے فوراً پکڑ لیا کہ 'کیا بات ہے؟ تم ہو کون؟ خواب گاہ میں آئے کیسے؟' تو معافی مانگنے لگا کہ 'حضرت! آپ سو رہے تھے تو میں سوچا کہ اٹھا دوں۔' پوچھا 'تم ہو کون؟' بتایا کہ 'میں شیطان ہوں۔' پوچھا 'اتنی ہمدردی کیسے ہوگئی؟' کہنے لگا کہ 'کل آپ کی تہجد چھوٹ گئی تھی،

آج پڑھ لیجیے۔‘ کہنے لگے کہ ’نہیں، میں تجھے چھوڑوں گا نہیں، پہلے بتاؤ کہ اتنی ہمدردی کیوں؟‘ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ شیطان انسان کی ہمدردی کرے، جب کہ اللہ نے فرمایا ہے: اِنَّ الشَّیْطَانَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْہُ عَدُوّاً۔[فاطر:٦] شیطان تمھارا دشمن ہے، تم اسے دشمن بناؤ۔ جب زبردستی اس سے پوچھا تو بتایا کہ ’اصل میں کل آپ کی تہجد چھوٹ گئی تھی، چھڑانے والا میں ہی تھا، لیکن آپ اتنا روئے کہ میں نے دیکھا کہ عالم غیب میں آپ کو اس ایک تہجد کی وجہ سے بہت سی تہجد کا ثواب مل گیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ بہت سی تہجد کا ثواب ملے، اسی لیے آج اٹھانے آ گیا۔‘ وہ اگر ہمدردی کرنے آتا ہے تو ہمدردی نہیں ہوتی، وہ اصل میں دشمنی ہوتی ہے۔ شیطان کا سارا اختیار اسی میں چلتا ہے۔

خیر و شر دونوں طرح کا اختیار انسان کو ملا ہے:

اللہ نے آزمائش کے لیے ایک تیسری مخلوق پیدا کی جس میں دونوں صلاحیتیں رکھیں کہ وہ اپنے اختیار سے فرماں برداری بھی کرے اور اپنے اختیار سے نافرمانی بھی کر سکے۔ اسی استعداد کے ساتھ خاص ماحول بھی دے دیا گیا۔ اب انسان میں شہوت بھی ہے، غصہ بھی ہے، تواضع بھی ہے، جھکاؤ کی صلاحیت بھی ہے، پاک دامنی اور پاک بازی بھی ہے۔ ان سب چیزوں کے ساتھ ایک ماحول تیار ہوگیا ہے، اب کوئی اپنے اختیار سے عبادت کی طرف جائے، یا نافرمانی کی طرف جائے۔ کُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَاءِ وَهٰٓؤُلَاءِ۔ [بنی اسرائیل:۲۰] اللہ نے ایک دستور بنا دیا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ ایک آدمی چوری کرنے جائے اور اس کا پیر شل ہو جائے، چوری نہ کر سکے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی آدمی کسی کو زبردستی مارنے گیا اور مارنے والے کا ہاتھ ہی شل ہو گیا ہو، یا کسی پر ناحق گولی چلا رہا ہے لیکن گولی ہی مس ہو جا رہی ہے۔ ہاں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی کی بزرگی اور اللہ کی خاص نصرت کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ ہاتھ اٹھا، مگر شل ہو کر رہ گیا، پاؤں نہیں چل سکا۔

رسول اللہ ﷺ جب ہجرت کے لیے جا رہے تھے تو سراقہ بن مالک آپ کے پیچھے چلا اور گھوڑا دوڑتا ہوا بالکل قریب آ گیا تھا، قریب تھا کہ وہ آپ کو پا لے، بس

اچانک اس کے گھوڑے کا پاؤں زمین میں دھنس گیا۔ کوئی دلدل اور نرم زمین نہیں تھی، پتھریلی زمین تھی، مگر اس کے گھوڑے کا پاؤں دھنس گیا۔ اب وہ فال دیکھتا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے، تو اس کو فال میں ملتا ہے کہ واپس جانا چاہیے۔ جب وہ واپس جانے کا ارادہ کرتا ہے تو پاؤں نکل آتا ہے۔ کسی کی عظمت اور بڑائی کے لیے ایسا ہوسکتا ہے۔

چنانچہ بہت سے ایسے واقعات احادیث میں موجود ہیں جنھیں نہیں ہونا تھا لیکن اللہ کی قدرت سے ہوگیا، لیکن عام دستور یہ نہیں ہے کہ کوئی شخص نافرمانی کرنا چاہتا ہو اور اس کو نافرمانی سے زبردستی روک دیا گیا ہو، فرماں برداری کرنا چاہتا ہو تو اس کو اچانک بہت سی طاقت مل جائے۔ ایک بیمار ہے، وہ نماز پڑھنا چاہتا ہے تو ایسا نہیں ہے کہ وہ بہت بڑی فرماں برداری کرنے جارہا ہے، اس لیے جو بستر سے اٹھ نہیں سکتا تھا، اللہ اسے کھڑا کردیں اور وہ نماز پڑھنے لگ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ’ٹھیک ہے، تم کھڑے نہیں ہو سکتے تو بیٹھ کر پڑھو، اور بیٹھ نہیں سکتے تو لیٹ کر پڑھو۔‘ حالاں کہ اللہ چاہتے تو یہ کر سکتے تھے کہ اس کو کھڑا کردیں، مگر یہ اسباب کی دنیا ہے، اس میں کسی کا اختیار سلب نہیں کیا جاتا، جو برائی کرنا چاہے، اسے اس کا اختیار ہے اور جو بھلائی کرنا چاہے اسے اس کا اختیار ہے۔ كُلًّا نُّمِدُّ هٰؤُلَاءِ وَهٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ۔ جو جیسا ارادہ کرتا ہے، اس کو ویسی ہی خدا کی مدد ملتی ہے۔ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا۔ [بنی اسرائیل: ۲۰] تمھارے رب کا عطیہ رکا ہوا نہیں ہے، ہر ایک کو پہنچتا رہتا ہے۔

جزا وسزا کا تعلق اختیاری امور ہی سے ہے:

انسان کو اپنے اختیار ہی کی وجہ سے کمالات اور سزائیں ملتی ہیں۔ یہ درمیانی مخلوق ہے، اسے اختیار کلی حاصل ہے، اور یہی اس کا کمال ہے۔ اس لیے جو لوگ کہتے ہیں ’انسان مجبور ہے‘ وہ غلط کہتے ہیں، انسان کسی اعتبار سے مجبور نہیں ہے، ہاں جن اعتبار سے مجبور ہے، اس پر کوئی جزا وسزا نہیں ہے۔ بیمار ہونا انسان کے اختیار میں نہیں ہے اور اس پر انسان مجبور ہے، اسی لیے اس پر جزا وسزا کچھ بھی نہیں ہے۔ آدمی بیمار ہے،

کھڑا ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتا تو بیٹھ کر پڑھے، لیٹ کر پڑھے، اگر لیٹ کر بھی نہ پڑھ سکے تو موخر کر دے، اسے کوئی گناہ نہیں ہے۔ آدمی سو گیا اور آنکھ وقت پر نہیں کھلی تو سونا بھی انسان کی ایک مجبوری ہے، نماز قضا ہو گئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ 'کوئی بات نہیں، جب آنکھ کھلے، اسی وقت پڑھ لینا۔ جب تک آنکھ نہیں کھلی تھی، اس وقت تک اس پر کوئی گناہ نہیں تھا۔

انسان کو اللہ نے اختیار عطا فرمایا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے انسان فرشتوں سے بازی لے گیا۔ اس لیے کہ اپنے اختیار سے اپنے مخالف ماحول میں جو اس کی طبیعت کے، مزاج کے، اس کے ایمان کے، اس کے دین کے اور اطاعت کے بالکل خلاف ہے، جب اپنے ارادے سے کام کرتا ہے اور اعمال صالحہ کرتا ہے تو اتنا آگے پہنچتا ہے کہ فرشتوں سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔

انسان مجبور نہیں ہے:

الغرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر کوئی کہے کہ انسان مجبور ہے تو اس کا کہنا صحیح نہیں ہے۔ مولانا روم نے لکھا ہے کہ 'جو لوگ انسان کو مجبور کہتے ہیں انھیں تو کتے اتنی عقل بھی نہیں ہے۔ کتے کو اگر آپ لاٹھی اور پتھر سے ماریں تو اگر وہ غصہ سے جھپٹے گا تو لاٹھی اور پتھر پر حملہ آور نہیں ہوگا، بلکہ اس کے مارنے والے کو دوڑائے گا۔ پتھر اور لاٹھی کی طرف دیکھے گا بھی نہیں۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ جانور کے پاس بھی اتنی عقل ہے۔'

مجبوری پر کوئی سزا نہیں ہوتی لیکن جو کام اختیار سے ہوتا ہے اس پر تو جزا وسزا ہوتی ہے۔ مولانا روم نے اس کو ایک مثال سے سمجھایا ہے کہ 'ایک آدمی دوسرے کے سیب کے درخت پر چڑھ گیا اور سیب توڑ توڑ کھانے لگا تو مالک نے کہا 'ارے بابا! کیوں میرے درخت پر چڑھے ہو۔' تو اس نے کہا 'چپ رہو، یہ تمھارا سیب ہے کہ اللہ تعالی کا ہے؟ اللہ کا سیب ہے، اللہ کا میں ہوں، ارادہ بھی اللہ ہی کی وجہ سے ہے، سب کچھ اسی کا ہے، تم کیوں بول رہے ہو، تم کو کوئی حق بولنے کا نہیں ہے۔' اس نے کہا 'ٹھیک ہے، آرام سے کھاؤ۔'

جب وہ نیچے اترا تو مالک نے اپنے خادموں سے کہا کہ ’رسی میں باندھ دو، اور لاٹھی سے پیٹو۔‘ جب لاٹھی سے پٹائی شروع ہوئی تو چلانے لگا ’کیوں مار رہے ہو؟‘ تو مالک نے کہا ’بولو مت، تم بھی خدا کے، یہ رسی بھی خدا کی، لاٹھی بھی خدا کی، ارادہ بھی خدا کا، بیچ میں تم کیوں بول رہے ہو۔‘ وہی فلسفہ جو اس نے اپنے لیے استعمال کیا تھا، جب اسے اس طرح سمجھایا گیا تو فوراً بول پڑا کہ ’ہاں ہاں، اب بالکل سمجھ میں آ گیا۔‘

میرے بھائیو! انسان مجبور نہیں ہے، اگر مجبور ہوتا تو اس کا کوئی کمال نہیں ہوتا۔ کمال اور فضیلت ہی کے لیے اللہ نے اسے اختیار دیا ہے۔ چنانچہ اللہ نے فرمایا: اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَةَ۔ ہم نے امانت رکھی۔ امانت یعنی اختیار کے ساتھ انسان کا مکلّف ہونا کہ انسان شریعت کا پابند ہو، احکام الٰہی کا پابند ہو۔

ہم نے امانت رکھی آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے تو انھوں نے اس کو اٹھانے کا انکار کر دیا۔ (اور ان کا یہ انکار از راہ سرکشی نہ تھا) وہ اس سے ڈر گئے (ان کو اندازہ ہوا کہ ہم اس کا حق نہیں ادا کر سکیں گے، اس لیے انھوں نے انکار کر دیا) البتہ انسان نے اٹھا لیا (کمزور تھا، ناتواں تھا) انسان بڑا ظالم ہے، بڑا جاہل ہے۔ (عاقبت نہیں دیکھی، انجام نہیں سوچا) اللہ کا یہ ظالم اور جاہل کہنا از راہِ محبت ہے۔

انسان کو اختیار ملا تو تین گروہ ہو گئے:

آگے فرماتے ہیں: لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ الۡمُنَافِقِيۡنَ وَالۡمُنَافِقَاتِ وَالۡمُشۡرِكِيۡنَ وَالۡمُشۡرِكَاتِ۔ اب یہ اختیار آیا ہے تو تین گروہ ہو گئے: ایک وہ جو مانتے نہیں ہیں، مگر زبان سے ماننے کا اقرار کرتے ہیں۔ یعنی ان کا دل اور زبان ایک نہیں ہیں۔ یہ منافقین ہیں۔ اور دوسرے وہ جو اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔ یہ دونوں گروہ عذاب میں پڑیں گے۔ اس لیے کہ اپنے اختیار سے انھوں نے نفاق یا شرک کیا ہے۔ اور تیسرا گروہ وہ ہے جو دل سے مانتا بھی ہے اور زبان سے اقرار بھی کرتا ہے۔ یہ مومن ہیں۔ ان کے بارے میں فرماتے ہیں: وَيَتُوۡبَ اللّٰهُ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنَاتِ۔ اللہ ایمان والے مردوں

اورعورتوں پرخصوصی توجہ فرمائیں گے،اوراگرکمزوری کی وجہ سے یااس دنیاکے ماحول کی وجہ سےان سے کچھ غلطی ہوئی ہوگی تواسے معاف کردیں گے۔

اللہ نے مغفرت کے بہت سے اسباب مہیا کردیے ہیں:

وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَحِیْمًا۔ اللہ مغفرت فرمانے والاہے،رحم کرنے والا ہے۔ کوئی اپنی ضداورسرکشی کی بناپراپنے اختیارکا ناروااستعمال نہ کرےتو پھراس کی بہت سی غلطیاں ایسی ہوں گی جن کواللہ یوں ہی معاف کردے گا۔ چنانچہ کتنی چیزیں ایسی اللہ نے رکھ دی ہیں جن سے آدمی کی غلطیاں معاف ہوتی رہتی ہیں۔صبح اٹھتے ہی معافی کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔اس لیے کہ ایک مومن جب بیدارہوتا ہےتو پہلا کام وضوکرتا ہے،اور وضومیں جہاں جہاں پانی ڈالتاہے،اس کی غلطیاں جھڑتی جاتی ہیں۔ پھروضوکے بعدوہ دو چاررکعت نماز پڑھتا ہے۔اگروہ نماز پڑھ لیتا ہےتو جوگناہ بھی رہتا ہے،سب ختم ہوجاتا ہے۔مغفرت کے اتنے اسباب مقررکردیے ہیں اور یہ انسان کے صحیح ارادہ کی وجہ سے ہے۔ایمان ایک صحیح ارادہ ہے،اس کی برکت سےتمام غلطیاں معاف ہوجاتی ہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

❑❑❑

مدرسہ عربیہ سعیدیہ اشرف العلوم مصطفیٰ ایجوکیشنل سوسائٹی

کرتھیا، مہراج گنج، یوپی

آج سے تقریباً اسی سال پہلے قائم ہونے والا ادارہ اپنی بیش بہا خدمات کی وجہ سے علاقے میں تعارف کا محتاج نہیں۔ اس علاقے کا کوئی گاؤں ایسا نہیں جہاں کا کوئی پڑھا لکھا انسان ایسا ہو جو ادارہ ہذا کا براہ راست یا بالواسطہ خوشہ چیں نہ ہو۔ ادارہ ہذا اپنے مخلص بانیوں کے اخلاص اور ان کی آہ سحر گاہی کی برکت سے روز بروز ترقی کے منازل طے کر رہا ہے۔

بحمد اللہ شعبہ پرائمری درجہ پانچ تک دین کی معیاری بنیادی تعلیم، عصری تعلیم کے ساتھ دی جاتی ہے۔ خصوصاً قرآن پاک کو درست تلفظ کے ساتھ پڑھانے کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ مزید شعبہ پرائمری کو آئندہ دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم درجہ آٹھ تک لے جانے کا ارادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائیں اور آسانی پیدا فرمائیں۔ آمین

شعبہ عربی: دار العلوم دیوبند کے نہج پر کافیہ تک کی تعلیم ہو رہی ہے، اس کو بھی جلالین شریف تک لے جانے کا پختہ ارادہ ہے۔

شعبہ حفظ و ناظرہ: اس شعبہ میں بحمد اللہ چار درس گاہیں مصروف خدمت ہیں۔

بفضل تعالیٰ ادارہ ہذا کی تعلیمی و تعمیری ترقیات کے ساتھ اس کی خدمت کا دائرہ وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔

رفاہی خدمت کے طور ادارہ ہذا ہر سال اپنے ضلع کے حاجیوں کے لیے حج تربیتی کیمپ منعقد کرتا ہے۔ اپنے اسلاف کے علمی اثاثے کی حفاظت کے لیے نشر و اشاعت کا بھی ایک شعبہ قائم ہے، جس سے اب تک "کاروان حرم"، "خطبات اعجاز" اور ایک مجلہ "اشرف العلوم" منظر عام پر آچکا ہے اور قدردانوں نے قدر کی نگاہ سے دیکھا، اصحاب ذوق نے پذیرائی کی اور اہل علم و قلم نے سراہا۔ اس شعبہ سے چوتھی کتاب خطبات اعجاز جلد دوم منظر عام پر آرہی ہے۔ خدا کرے یہ کتاب سابقہ مطبوعات کی طرح قبول عام حاصل کرے۔

حضرات اہل خیر سے گزارش ہے کہ ادارہ ہذا کا دامے درمے بھرپور تعاون فرما کر مستحق اجر و ثواب بنیں۔

آئینہ مدرسہ

سن تاسیس: ۱۳۶۱ھ مطابق ۱۹۴۰ء۔ تعلیم: درجہ فارسی سے عربی سوم تک، شعبہ حفظ و ناظرہ ۷ درس گاہ، پرائمری درجہ پانچ تک۔ بیرونی طلبہ: ۱۲۰۔ مقامی طلبہ: ۲۵۰۔ مدرسین و ملازمین: ۲۰۔ اخراجات تقریباً ۱۸ لاکھ